محبت سوگ ہوتی ہے
نمرہ نور

ناول

نمرہ نور

محبت سوگ ہوتی ہے

رات سات بجے کا وقت تھا۔ سیالکوٹ ایئر پورٹ کے انتظار گاہ میں جم غفیر تھا۔ وہاں مسافروں کو لینے کے لیے آنے والوں کا رش تھا۔ بھانت بھانت کی آوازیں، جوش اور خوشی سے چہکتی بولیاں۔ جس کا جتنا قریبی رشتے دار تھا، اتنا ہی انداز جوشیلا تھا۔ انہی میں وہ لوگ بھی گلاس ڈور پر نظر جمائے محوِ انتظار میں کھڑے تھے، جہاں سے کچھ مسافر اپنا سامان لیے باہر نکل رہے تھے۔

"اف! یہ دری کہاں رہ گیا؟ ہم یہاں انتظار کی سولی پر لٹک رہے ہیں اور وہ صاحب ابھی تک باہر نکلنے کا نام نہیں لے رہے۔" ایک جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔ تبھی ایک سات سالہ بچہ پر اشتیاق آمیز لہجے میں چلایا۔

"وہ رہے دری چاچو۔" آواز کانوں سے ٹکرائی، انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، نگاہیں اس طرف اٹھیں، جہاں وہ اپنی بھرپور وجاہت کے ساتھ، گرے رنگ کے پینٹ کوٹ میں ملبوس،

سیاہ بالوں کا سپائکس بنائے ہوئے، بائیں ہاتھ میں ہینڈ کیری پکڑے، نگاہیں کسی کی تلاش میں تھیں لیکن نہیں ان نگاہوں کی تلاش تو شاید کبھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

آج پانچ سال بعد دریاب مرزا نے پاک سرزمین میں قدم رکھا تھا۔اس کی نگاہیں ایک جگہ رکیں، جہاں اس کے بڑے بھائی زریاب مرزا کھڑے تھے جنہوں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا ان کی طرف آیا جہاں اس کی ماں، بہن، بھائی، بھابھی اور بھتیجا کھڑا تھا۔وہ باری باری سب سے ملا۔اس کی ماں کے تو خوشی سے آنسو ہی نہیں تھم رہے تھے۔دریاب مرزا کے برعکس وہ سب اسے اتنے سالوں بعد دیکھ کر بہت خوش تھے۔

"چلیں بھئی، اب جلدی سے گھر چلیں، عالیہ کا فون پر فون آرہا ہے کہ ہم اس کے میاں کو لے کر ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچے۔" زریاب بھائی نے اس کے سامان والا بیگ کار کی ڈگی میں رکھا۔وہ زریاب بھائی کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی سات سالہ شہیر اس کی گود میں بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔وہ بے توجہی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔اس کا دل و دماغ اس وقت کہیں اور ہی کھویا ہوا تھا۔وہ سب کیا باتیں کر رہے تھے، اس سے کیا کہہ رہے تھے، وہ بے دھیانی سے جواب دے رہا تھا۔ان کی گاڑی سڑک پر محوسفر تھی اور اس کا دل ایک وادی میں سفر کر رہا تھا، جہاں وہ خود کو کھو چکا تھا۔جہاں اسے اپنی منزل شاید کبھی نہیں ملنی تھی۔

آج وہ اتنے سالوں بعد اپنوں کے بیچ لوٹا تھا لیکن اس کے احساسات ویسے کے ویسے ہی تھے جیسے پانچ سال پہلے یہاں سے جاتے ہوئے تھے۔خاموش لب، ویران، سنسان سا دل، حزن وملال سے بھری آنکھیں، سپاٹ، سنجیدہ چہرہ، نا جانے اس شخص کو کونسا دکھ تھا، جو اسے اندر ہی اندر اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا، کون جانے دریاب مرزا کس کی یاد میں، کس کے دکھ میں تھا، کون جانے؟

یوں برستی ہیں تصور میں پرانی یادیں
جیسے برسات کی رم جھم میں سماں ہوتا ہے

☆......☆......☆

رات بے حد حسین تھی۔فضا میں رات کی رانی، چنبیلی اور موتیا کے پھولوں کی خوشبو، گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک، ساون کی بھیگی بھیگی سی ہوائیں ایک لطیف سا احساس پیدا کر رہی تھیں۔وہ چلتی ہوئی ٹیرس کے گلاس ڈور کو کھولتے ہوئے گیلری میں نکل آئی۔ساون کی مہکتی ہوائیں، پھولوں کی خوشبوئیں، بارش کی رم جھم کرتی بوندیں، چاند کی ہر سو پھیلتی چاندنی نے اسے اداس سا کر دیا تھا۔وہ بے خودی کے عالم میں چاندنی دیکھتے اور پھولوں کی مہک کو اپنے اندر سرائیت کرتے ہوئے بارش میں بھیگ رہی تھی۔یہ دسمبر کی رات تھی اور کافی حد تک سردی تھی لیکن وہ بغیر سوئیٹر، شال کی پرواہ کیے اپنے وجود کو بارش کے قطروں میں بھگو رہی تھی، ارد گرد سے بیگانہ۔وہ جو ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا اسے بارش میں بھیگتا دیکھ کر ٹھٹک گیا پھر غصے سے اس کی طرف قدم بڑھائے اور اس کے بھیگتے ہوئے وجود کو بازوؤں سے کھینچتا اندر لے آیا۔

''پاگل ہوگئی ہو تم، اتنی سردی میں بارش میں بھیگ کر مرنا ہے کیا؟'' دبے دبے اشتعال میں بولا پھر رکا۔اس موسم میں، اس لہجے میں، ان لفظوں میں کسی اور نے بھی وہ بولا تھا، لمحے بھر کے لیے وہ ہنستا مسکراتا پری چہرہ اس کی آنکھوں میں ابھر کر فضا میں تحلیل ہوا۔وہ بھیگا وجود لیے ،اس کے سامنے کھڑی اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھ رہی تھی جس پر لمحہ پہلے غصے کے تاثرات تھے اور اب جیسے تکلیف میں ڈوب چکا تھا۔

''دریاب۔'' لب وا ہوئے، ہاتھوں میں حرکت ہوئی تھی۔

"جاؤ جا کر چینج کرو ورنہ بخار ہو جائے گا۔" وہ خود کو کمپوز کرتا، لاپرواہی سے بولتا وہاں سے ہٹنے کو تھا۔ جب اس کا بھاری ہاتھ دو ہاتھوں کی نرم گرفت نے اپنی قید میں کرلیا، قدم جامد ہوئے، کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ باہر بارش کی بوندوں کی رم جھم، ہوا سے ہونے والی پتوں کی سرسراہٹ ہنوز جاری تھی۔

"آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں دری؟" کانپتے لہجے میں شکوہ ابھرا۔ "میرا قصور کیا ہے؟" توقف سے پوچھا گیا۔

"پانچ سال سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں دری، پانچ سال سے۔" نینوں سے اشک گالوں پر پھسلنے کو تیار تھے۔ جس سے شکوہ کناں تھی وہ خاموش تھا۔ باہر بادلوں کی گرجنے کی آواز، ہواؤں کی آپس میں سرگوشیاں کمرے میں سنائی دے رہی تھیں۔

"بنا آپ سے بات کیے، بنا آپ کی آواز سنے، پانچ سال سے آپ کے لوٹنے کا انتظار کیا ہے، اور آج آپ کو آئے ہوئے دس دن ہوگئے ہیں، بات کیا آپ نے تو مجھے دیکھنا بھی گوارہ نہیں سمجھا دری۔" دریاب مرزا نے اسے دیکھا جو کانپتے ہوئے، اس کے سینے پر سر رکھے آنسوؤں کے بند توڑ رہی تھی، آخر کب تک وہ نازک لڑکی صبر کرتی، صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا، تکلیف بڑھ رہی تھی۔

"سردی بہت ہے، جا کر چینج کرلو ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔" سپاٹ انداز میں کہتا اس سے دور ہٹا، جیسے سچائی سے روح موڑ رہا ہو۔

سچائی سے رُخ موڑ لینے یا آنکھیں بند کرنے سے نہ کبھی سچائی بدلی ہے اور نہ بدلے گی البتہ اس سے اپنا نقصان اور اپنے ساتھ جڑے پیاروں کو تکلیف ضرور پہنچا دیتے ہیں۔

"دیکھ رہی ہو تم خود تو چلی گئی، لیکن دری کے دل میں آج بھی زندہ ہو، میری جگہ کیسے بنے

گی وہاں؟'' وہ زمین پر روتے ہوئے گرتی چلی گئی، باہر ایک دفعہ پھر بادل زور سے گرجے تھے جیسے وہ بھی اس کے ساتھ رو رہے ہوں۔

بہت دشوار ہوتا ہے
کہیں کسی کی بیرخی کو سہنا
کہیں آنکھوں سے اشکوں کا بہنا
کہیں اپنے حال دل کو چھپا لینا
کہیں کسی کا بے وجہ روٹھ جانا
کہیں درد کو زباں نہ ملنا
کہیں لبوں کا خاموش ہو جانا
بہت دشورا ہوتا ہے

(نمرہ نور)

کوئی ماضی کی جھرکوں سے صدا دیتا ہے
سرد پڑتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتا ہے
دل افسردہ کا ہر گوشہ چھنک اٹھتا ہے
ذہن جب یادوں کی زنجیر کو ہلا دیتا ہے
حال دل کتنا ہی انسان چھپائے یارو
حال دل اس کا تو چہرہ ہی بتا دیتا ہے
کسی بچھڑے ہوئے کھوئے ہوئے ہم دم کا خیال

کتنے سوئے ہوئے جذبوں کو جگا دیتا ہے

وقت کے ساتھ گزر جاتا ہے ہر ایک صدمہ

وقت ہر زخم کو ہر غم کو مٹا دیتا ہے

اسے پاکستان آئے ہوئے آج گیارہ دن ہونے کو تھے، ان گیارہ دنوں میں وہ پہلے دن جاگنگ کے لیے نکلا تھا۔ رات کو ہونے والی بارش تھم چکی تھی، سڑک پر کہیں کہیں پانی کھڑا تھا، وہ ٹریک سوٹ میں ملبوس، سر پر ہڈ کو گرائے ہوئے، کانوں میں ہینڈ فری لگائے، اپنی ہی دھن میں طویل سڑک پر دوڑتا ہوا ایک وسیع و عریض پارک میں پہنچا جہاں وہ ہمیشہ آیا کرتا تھا اور آج وہ یہاں پانچ سال بعد آیا تھا۔ وہ اب رک کر لمبے سانس لیتا پارک کو چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اونچے سرسبز درخت، گلاب، چنبیلی، گیندے، گل بہار اور بھی بہت سے پھول جو جگہ جگہ لگے ہوئے تھے، بارش کے بعد سب کچھ نکھرا اور تر و تازہ لگ رہا تھا۔

صبح کی سیر اور ورزش تو ہمیشہ ہی اس کا شغف رہی تھی لیکن آج اسے یہ پارک اور پارک میں ہر چیز جیسے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے پانچ سال پہلے تھا۔ رنگ برنگے پھول، پھولوں کی خوشبو، ہرے ہرے اونچے درخت، ہر درخت کے نیچے سنگی بینچ۔ پارک میں صبح کی سیر کے لیے آئے ہوئے لوگ سب کچھ پہلے جیسے تھا، اگر کوئی بدلہ تھا تو وہ خود۔ دریاب مرزا بدل چکا تھا۔ وہ چلتا ہوا چیری بلاسم کے درخت کے نیچے سنگی بینچ پر بیٹھ گیا۔ بہت سی یادوں کے ساتھ وہ گلابی پھول اس پر بکھرنے لگے یک دم جیسے سب کچھ رک گیا تھا۔ شاید اس کے دل کی چلتی دھڑکن بھی۔

پھول ابھی بھی آہستہ آہستہ گرتے جا رہے تھے۔ آنکھیں اس کی ایک ہی منظر پر ٹک گئی تھیں۔ وہ اس کے بہت پاس تھی اتنی کہ وہ اسے ہاتھ لگا کر چھو بھی سکتا تھا لیکن نہیں، وہ ایسا

نہیں کرے گا کیونکہ اسے معلوم تھا جب وہ اسے چھونے کے لیے بڑھے گا وہ ہمیشہ کی طرح اس سے دور چلی جائے گی۔ وہ بس اسے دیکھتا رہا تھا جو اسی کے بینچ پر سفید اور گلابی رنگ کی بڑے سے گھیرے والی فراک میں ملبوس، سیاہ ریشمی بال آبشار کی طرح بکھرے ہوئے، جن کے ساتھ ہوا اٹکھیلیاں کر رہی تھی، ایک بازو کو گود میں رکھے دوسرے بازو کی کہنی کو بینچ کی پشت پر رکھ کر نرم وملائم سفید ہاتھ کو ٹھوری کے نیچے رکھے، ہونٹوں پر وہی مسکان جو اس چہرے کی جان تھی، آنکھوں میں وہی دیوانگی، جو صرف اور صرف سامنے بیٹھے شخص کے لیے تھی۔

"واہ پراؤڈی پرنس آج تم یہاں آ ہی گئے۔" ٹھوڑی کے نیچے رکھے مخروطی انگلیاں حرکت میں آئیں، بڑی بڑی مغلی آنکھیں پھیلائی گئیں، لہجے میں وہی شرارت چھپی تھی، جو اس پری چہرہ لڑکی کا خاصہ تھی۔

"ویسے تم بہت بدل گئے ہو، کہیں سے بھی تم میرے پہلے والے پرنس نہیں رہے، جن آنکھوں میں جگنو جیسے چمک ہوتی تھی، ان میں ملال کیسا؟" وہ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، یک لخت اس کا لہجہ اداس ہو گیا تھا۔

"جن لبوں کے مسکرانے سے زندگی مسکراتی تھی؟ وہ اداس کیوں؟" وہ سراپا سوال بنی اسے دیکھ رہی تھی، جس کا جواب وہ خود تھی، وہ کہنا چاہتا تھا، کیا تم نہیں جانتی میں ایسا کیوں ہو گیا ہوں؟ کیا تم نہیں جانتی تمہارے پراؤڈی پرنس کے آنکھوں کے جگنو کیوں ماند پڑ گئے؟ کیا تم نہیں جانتی میرے لبوں کی ہنسی کیوں اداس ہو گئی؟ لیکن وہ خاموش رہا، بس اسے دیکھ رہا تھا، ایک لحمہ بھی آنکھ نہیں جھپکی تھی، جیسے اگر وہ آنکھیں بند کر کے کھولے گا تو وہ غائب ہو جائے گی، جو وہ نہیں چاہتا تھا، وہ بس اسے دیکھنا چاہتا تھا، اسے بولتے دیکھنا چاہتا تھا، پانچ سال سے تو وہی بات کرتی، چاہے ایک جھلک ہو وہ بات کرتی، دریاب مرزا بس اسے سنتا تھا، اس

کی زندگی جیسے اس مسکراتی ہوئی زندگی پر ٹھہر گئی تھی۔

''اوووہیلو مغرور شہزادے کہاں کھو گئے ہو؟'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی بھی اس کے سامنے ویسے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

''تجھ میں کھو گیا ہوں زندگی، لیکن تم کہاں کھو گئی ہو؟'' وہ بولا نہیں تھا لیکن روم روم اس کا تکلیف میں ڈوبا، اس سے سراپا سوال تھا۔

''پہلے کی طرح بن جاؤ نادریاب مرزا، تمہیں ایسا دیکھ کر زندگی خوش نہیں ہے، زندگی تڑپتی ہے، اب تو خواہش پوری کر دو دری۔ اب تو میری خواہش پوری کر دو۔''

وہ پری چہرہ چیری بلاسم کے پھولوں میں تحلیل ہو چکا تھا، اس کے آخری الفاظ ارد گرد بازگشت تھے، جیسے پارک میں موجود ایک ایک چیز یہی کہہ رہی ہو۔

''اب تو میری خواہش پوری کر دو دری۔''

شہد رنگ آنکھوں سے دو بے نام سے موتی گال سے پھسلتے ہوئے، زمین میں جذب ہوتے گئے۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟ جب جانا ہی تھا، تو میرے دل میں جاتے جاتے بسیرا کیوں کر گئی تم؟ کیوں زندگی؟ کیوں؟''

اک بے نام سا درد ہے
جو تیری یاد میں اٹھتا ہے

✡......✡......✡

وہ صبح زریاب بھائی اور بابا کے ساتھ آفس چلا گیا تھا، اشفاق مرزا (بابا) چاہتے تھے اب وہ بھی ان کے ساتھ زریاب کی طرح ان کا بزنس سنبھالے، اب وہ بھی سنجیدہ ہو گیا تھا پانچ

سال تو وہ لندن میں جاب کرتا رہا تھا۔ لیکن اب بابا کی بات مانتے ہوئے اپنے بزنس کو سنبھالنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

لنچ کا وقت تھا تو وہ گھر آ گیا یہ سوچ کر کہ ماما کے ہاتھ کا لنچ کرے گا۔ جبکہ زریاب اور اشفاق مرزا کا کوئی آفشیلی لنچ تھا تو وہ آفس میں ہی تھے، اسے بھی جوائن کرنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

وہ گھر آیا تو گھر میں چھائی خاموشی اس نے واضح محسوس کی تھی۔

''ماما کہاں ہے؟'' وہ ماما کو ڈھونڈتا ہوا کچن میں آیا جہاں ملازمہ کام کر رہی تھی۔ گھر میں شاید کوئی بھی نہیں تھا۔

''جی چھوٹے صاحب وہ بڑی بیگم اور باقی سب ساتھ والے گھر گئے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، تم ایسا کرو اگر کچھ کھانے کو ہے تو لے آؤ میں باہر لان میں بیٹھا ہوں۔''

وہ اسے کہتا ہوا وہاں سے نکل کر باہر لان میں آ گیا اور لان میں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گیا۔ جب اس کی نگاہ اپنے گھر کے ساتھ والے گھر پر اٹھی، اس گھر کی چھت، دیواریں، اسے جیسے بہت کچھ یاد دلا گئی تھیں۔

''اوئے پراوڈ ی پرنس کیا کر رہے ہو؟'' ایک نسوانی آواز ابھری، کسی نے دیوار سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''تمیز سے بات کیا کرو مجھ سے۔'' ایک رعب دار اور غصے سے بھری آواز میں تنبیہ کی گئی۔

''لو تم کونسا میرے ماموں کے پتر ہو جو تم سے تمیز داری سے بات کروں۔'' وہ بھی اپنے نام کی تھی جب تک اس کو چڑا نہ لے اس کا دن گزرنا ہی مشکل تھا۔

''میں تمہارا ٹیچر ہوں۔'' مقابل نے غصے سے آنکھیں دکھائیں، جیسے اسے یاد دلانے کی

کوشش کی ہو۔

''اوئے اکڑو، یہ تیرے اندر جو ہر وقت ماسٹر کی روح پھڑکتی ہے، اسے قابو میں کرو، ورنہ میں انکل سے شکایت لگا کر تمہارے ہاتھی جیسے کان پکڑا کر قابو میں کرواؤں گی۔'' اسے کہاں پرواہ تھی اس کے غصے کی۔ وہ جتنا مرضی چڑتا وہ اسے اور چڑاتی تھی۔

وہ منظر، وہی دیوار کی مختلف ڈیزائن میں چھپتا چلا گیا۔ اتنے میں ملازمہ وہاں آ گئی اور کھانا اس کے سامنے پڑی ٹیبل پر لگانے لگی۔ دریاب مرزا نے ایک نظر کھانے کو دیکھا، اس کی نظر چاولوں کی ڈش پر ٹھہر گئی، جب ملازمہ کی بات پر وہ چونکا۔

''صاحب جی یہ سب کھانا ساتھ والے گھر سے آیا ہے۔'' ملازمہ نے اسے یک ٹک میز پر لگتے کھانے کو دیکھتے پایا تو جھٹ سے معلومات فراہم کیں۔

''ساتھ والے گھر سے۔'' وہ بڑبڑایا۔ ساتھ ہی شہد رنگ آنکھیں بغل والے گھر پر اٹھیں۔

''جی صاحب یہ رانا ہاؤس سے آئے ہیں، آج ان کی چھوٹی بیٹی کی برسی تھی ناں۔'' ملازمہ مزید اسے معلومات دینے لگی۔ وہ بتا رہی تھی جبکہ اس کی سماعت میں ایک ہی لفظ بازگشت کرنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ کئی آوازیں تھیں، کسی کی ہنسی کے جلترنگ، باتیں، کومل سی آواز، ان سب میں ملازمہ کی آواز پس پشت پر چلی گئی تھی۔ اس کی نظر سامنے ڈش میں پڑی بریانی پر ٹک گئی، کیا کچھ نہیں تھا اس وقت اس کے چہرے پر، اس کی آنکھیں، دکھ ہی دکھ، درد ہی درد تھا۔ کچھ لمحے، کچھ یادیں، کچھ واقعات انسان کے دل و دماغ میں روشنائی کی طرح ہوتے ہیں، جسے چاہ کر بھی وہ محو نہیں کر سکتا۔

کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں، جو ہمیں کبھی بے معنی سی لگتی ہیں لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہی یادیں کبھی تنہائی اور کبھی بھیڑ میں ہمیں ستاتی ہیں، کہیں پر آنکھیں نم ہوتی ہیں، کہیں پر دل

میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ ملازمہ جا چکی تھی اور وہ بریانی کی ڈش کو یک ٹک دیکھتا ماضی میں کھویا ہوا تھا۔

"دریاب! تم جلدی آ گئے بیٹا، سب ٹھیک ہے ناں؟" طلعت بیگم اسے دیکھ کر حیران ہوئیں اور تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ان کے پیچھے ہی عالیہ اور نادیہ بھی تھیں۔ وہ ابھی رانا ہاؤس سے واپس آئی تھیں۔

"جی ماما! سب ٹھیک ہے۔ آپ کہیں گئی ہوئی تھیں؟" جان کر بھی وہ انجان بنا۔

"ہاں بیٹا! آج برسی تھی زندگی کی۔" بتاتے ہوئے ان کا لہجہ بھیگ سا گیا۔ آنکھیں کچھ نم سی تھیں جیسے وہ روئی ہوں۔

"میرا تو حلق منہ کو آتا ہے۔ جب آج کے دن اس گھر کے فرد فرد کی حالت دیکھتی ہوں۔ زندگی کے بعد تو جیسے سب کی زندگی جام ہو گئی تھی۔" ماما بول رہی تھیں اور دریاب مرزا دکھ کے گہرے گڑھے میں گرتا جا رہا تھا۔

عالیہ نے غور سے اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔ جس کے لبوں پر خاموشی اور آنکھوں میں درد رقم تھا۔ وہ اندر آ گئی جبکہ نادیہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ طلعت بیگم بھی اندر چلی گئی ہوئی تھیں۔ وہ خاموش سا نظروں کو زمین پر گاڑے ہوئے سوچوں کے گرداب میں الجھا ہوا تھا۔

"بھائی!" نادیہ نے پکارا۔

"ہوں۔" سوچوں کا تسلسل ٹوٹا۔

"زندگی کی یاد تو آتی ہو گی۔"

وہ چونکا۔ یہ سوال تھا تو بہت تکلیف دہ سوال تھا۔ دل سے درد کی لہر جیسے پورے بدن میں سرایت کرنے لگی۔

”نادیہ، وہ مجھے بھولی ہی کب تھی۔ جو یاد آتی ہوگی۔ وہ آج بھی میرے دل میں کچھ اس قدر براجمان ہے کہ خود سے فراموش ہی نہیں ہونے دیتی۔“ سوگوار سا لہجہ۔ دل کتنا اس کا کرلاتا ہے یہ دریاب مرزا کو ہی معلوم تھا۔

”بہت بھاگا ہوں اس کی یادوں سے۔ بہت التجا کی اس سے کہ دنیا سے تو چلی گئی ہو میرے دل سے بھی چلی جاؤ۔ اس دل کو بھی اپنی یادوں سے رہائی دے دو۔ لیکن نادی وہ تو ازل سے ہی ضدی رہی ہے۔ اپنی مرضی کرنے والی۔ کب کسی کی وہ بات مانتی ہے۔ زندہ تھی تب بھی......اور اب بھی۔“

وہ مرگئی ہے یہ لفظ آج بھی اپنی زبان سے ادا نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت بے بس تھا۔ نادیہ اپنے بھائی کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

آہ زندگی۔ ایک تم کیا گئی۔ سب کچھ رک سا گیا ہے۔ تم ٹھیک کہتی تھی۔ زندگی تو زندگی کے دم سے ہے۔ ہمارے گھروں میں رونق تو زندگی کے دم سے تھی۔“ نادیہ اندر ہی اندر زندگی سے مخاطب تھی۔ جو کبھی نہ واپس آنے کے لیے ان سب کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اپنی یادوں کے سہارے۔

”بھائی رانا انکل اور مطیعہ آنٹی تمہیں یاد کر رہے تھے ان سے پلیز مل آنا۔“ وہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگا۔ جب نادیہ بولی۔ قدم تھمے، آنکھیں بند ہوئیں۔ جیسے اس لمحے سے تو وہ کترا رہا تھا۔

وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ رانا ہاؤس جانے کا ارادہ نہیں تھا لیکن گھر سے باہر نکلتے ہی ارسل اس کو مل گیا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر بھاگ کر اس کے سینے سے لگ گیا۔ وہ کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ دریاب چند سیکنڈ بے یقینی سی کیفیت میں یونہی گھرا رہا۔ پھر اس نے بھی دونوں بازو

اس کے گرد باندھ کر جوابی ردعمل دیا۔

"دریاب بھائی! بہت ہی بے مروت ہو گے ہیں آپ۔" اس نے شکوہ کیا۔ مسکراتے ہوئے کہا۔

"آج اتنے دن ہو گئے آپ کو پاکستان آئے ہوئے۔ ایک دن بھی ہمیں ملنے کی زحمت نہیں کی۔"

دریاب مرزا اس کی بات پر مسکرا دیا۔

"تم تو ماشااللہ سے کافی بڑے ہو گئے ہو اور شکوے بھی کرنے لگے ہو۔" شرارتی انداز۔ چھیڑنے والا۔

"ہاہاہا۔ آپ بھی تو کافی بدل گئے ہیں اور ہم سے چھپنے بھی لگے ہیں۔" وہ بھی ہنسا۔ مزے سا طنز اچھالا۔ دریاب خاموش ہوا۔

"چلیں پھر اب گھر چلیں۔ ماما بابا آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے بولا۔ دریاب مرزا کے نا چاہتے ہوئے بھی قدم رانا ہاؤس کی جانب اٹھے۔ پھر دہلیز پار کی۔ گھر میں خاموشی کا راج تھا شاید سب اندر تھے۔

"ماما، ماما دیکھیں تو کون آیا۔" ارسل بھاگ کر اندر گیا۔ خوشی سے۔ اس نے اب لاؤنج میں قدم رکھے۔ من بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں اک حسینہ رہتی تھی۔ جس کا بسیرا اب اس کا دل تھا۔

ہر جگہ وہ اسے دیکھنے لگی۔ چلتی ہوئی، ہنستی ہوئی، اس کو چڑاتی ہوئی، غصہ کرتی ہوئی، چلاتی ہوئی، ناراض ہوتی ہوئی۔ جیسے وہ زندہ چلتی پھرتی نظر آنے لگی۔

"دریاب۔" مطیہ آنٹی اسے دیکھ کر مسکرائیں۔ والہانہ انداز سے وہ اس سے ملیں۔

"کہاں تھے اتنے دنوں سے۔ایک دن بھی اپنی آنٹی کو ملنے کا جی نہیں چاہا۔" مسکراتے ہوئے وہ بھی شکوہ کر رہی تھیں۔وہ سر جھکا گیا۔جیسے غلطی تسلیم کر رہا ہو۔بہانہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔اتنے میں سب وہاں چلے آئے۔

رانا انکل، معاذ، معیز بھائی، اسما بھابھی (معیز کی بیوی) اور ثوبیہ آپی۔(ایک بس وہ نہیں تھی جو ہمیشہ سب سے پہلے آتی تھی) سب اسے دیکھ کر بہت خوشی سے ملے تھے۔گزرے وقت کی کوئی بات نہیں تھی۔کوئی حوالہ نہیں تھا۔

اسے کھانے پینے کی کوئی طلب تو نہیں تھی مگر مطیہ آنٹی کے کہنے پر ملازمہ نے جھٹ پٹ چائے اور لوازمات چن دیے، اسے مجبوراً تھوڑا بہت لینا پڑا۔اس دوران ہلکی پھلکی گپ شپ جاری تھی۔

"دادی کہاں ہیں؟ وہ نظر نہیں آ رہیں۔" باتوں کے دوران یاد آیا تو ارد گرد نظر دوڑاتے اس نے پوچھا تھا۔اب مسکراتے لب سکڑے تھے۔خاموشی چھائی۔ماحول ذرا بوجھل ہوا۔اس نے بخوبی محسوس کیا۔معیز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔دریاب نے چونک کر دیکھا۔

"تمہیں یاد ہو گا دری! زندگی اور دادی کی کبھی نہیں بنتی تھی۔وہ اکثر اس کی حرکتوں سے عاجز رہتیں اور سب سے زیادہ ڈانتی بھی وہی تھیں۔" ایک آسودہ سے مسکان معیز کے لبوں پر تھی۔باقی سب بھی اس کے ذکر پر نم آنکھوں سے مسکرا دیے۔شاید ماضی کا کوئی واقعہ تازہ ہوا تھا۔

"اور دیکھو اس کے جانے کے ڈیڑھ سال بعد ہی دادی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئیں۔" معیز کی آنکھیں نم، لہجے میں یاسیت، دکھ کنڈل مارے ہوئے تھا۔دریاب کو اس کی بات پر جھٹکا لگا۔وہ اس خبر سے تو سرے سے ہی انجان تھا۔

”اکثر دادی بابا کو کہتی تھیں کہ رانا میرا من نہیں لگتا ہے اس گھر میں۔ مجھے اس گھر چھوڑ آ جہاں میری زندگی ہے۔ وہ وہاں اکیلی ہے اور اکیلے پن سے تو وہ گھبراتی ہے اس لیے مجھے اس کے پاس چھوڑ آ۔ تو دری پھر وہ واقعی چلی گئیں۔ جس سے سب زیادہ وہ چڑتی تھیں۔ اس سے اتنی محبت تھی کہ ہم سب کو بھی بھول گئیں۔“ معیز مزید بتا رہا تھا۔ دریاب مرزا کی آنکھیں جلنے لگیں۔ پتہ ہی نہ چلا آنکھوں سے کب آنسوؤں کا ریلا بہنے لگا۔

ماحول نے یاسیت کی چادر اوڑھ لی تھی۔ آج وہ خاندان کتنی دفعہ بہانے بہانے سے اس کو یاد کر کے رو چکا تھا۔ ہر کوئی سر جھکائے، چہرے چھپائے، گردن موڑ کر، منظر سے ہٹ کر اپنے آنسو چھپا رہا تھا۔ اسے دادی کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا تھا۔ جس کا اظہار اس نے بھیگی آواز، نم آنکھوں کے ساتھ، سر جھکائے سب سے کیا۔ سب نے مل کر ان کے لیے دعائے مغفرت کی تھی۔ اس کا دل جیسے بند ہونے لگا تھا۔ جب معیز اور معاذ نے اسے زندگی اور دادی کی لحد پر جانے کے لیے کہا۔

”جو میرے دل میں دھڑکنوں کی طرح ہر وقت شور مچاتی ہے۔ اس کی قبر پر کیسے جا سکتا ہوں یہ دل کیسے سہہ پائے گا۔“ دل بولا۔

”وہ مر چکی ہے۔ تم آج بھی یہ حقیقت تسلیم نہیں کر رہے دریاب مرزا۔“ دماغ نے جیسے اس پر افسوس سے کیا۔

”نہیں وہ زندہ ہے۔ بے شک وہ دنیا سے چلی گئی ہے۔ لیکن میرے اندر آج بھی وہ زندہ ہے۔“ دل نے فوراً دماغ کو جواب دیا۔ دماغ نے افسوس سے دل کو دیکھا۔ عجب ہی جنگ ان دونوں میں چھڑی ہوئی تھی۔

”دری کہاں کھو گئے ہو یار؟“ معاذ نے اس کا کندھا ہلایا۔

”چل اٹھ چلتے ہیں ورنہ تو جانتا نہیں ان دونوں دادی پوتی نے ہمارے خوابوں میں آ کر نیند کی بینڈ بجا دینی ہے۔ اگر یہ پھول ان پر چڑھا کر نہ آئے تو۔“ معاذ شرارتاً مسکرایا۔ وہ بھی آسودگی سے مسکرا دیا۔ نہ جانے کا عذر کیا کرے۔ اسی کشمکش میں تھا کہ۔

”دریاب بھاجی۔ دریاب بھاجی۔“

غلام فرید جو اس کے گھر کا ملازم تھا ہانپتا ہوا آیا۔ سب نے اسے دیکھا۔

”بھاجی جلدی گھر چلیں۔ عالیہ...... عالیہ بی بی۔“ ہانپنے سے اس کے لفظ ٹوٹ رہے تھے۔ آنکھوں سے رم جھم بھی جاری تھی۔ اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا تھا۔ وہ بغیر اس کی مکمل بات سنے باہر کو بھاگا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی وہ سب بھی لپکے تھے۔

بے چینی اور خدشے دل میں لیے وہ بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی رانا صاحب، مطیعہ بیگم، معیز اور معاذ بھی تھے۔ جیسے ہی اس نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ وہ لڑکھڑایا، چہرے کی رنگت اڑی۔ سامنے ہی عالیہ بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ طلعت بیگم اس کا سر گود میں لیے ہوش میں لانے کی کوشش میں تھی۔ زرد رنگت، سیاہ پڑے ہونٹ۔ اسے لگا جیسے وہ ایک پل کو ماضی میں پہنچ گیا ہو۔

”دری! یہ دیکھو عالی آنکھیں نہیں کھول رہی۔ بیٹا کچھ کرو۔ اسے ہوش میں لاؤ۔“ طلعت بیگم روتے ہوئے بولیں۔ وہ اپنے ماضی کے دردناک یاد سے چھٹکارا پاتے اس کی طرف بڑھا اور اس کے ٹھنڈے پڑے وجود کو اپنی بانہوں میں اٹھاتا باہر گاڑی کی طرف بڑھا۔

مطیعہ بیگم عالیہ کو دیکھ کر تو گرنے والی ہوگئی تھیں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ معیز نے ماں کے لڑکھڑاتے وجود کو سنبھالا۔ انہوں نے چھلکتی آنکھوں کے ساتھ اپنے بیٹے کو دیکھا۔ ایک پل میں ہی ان کی آنکھوں کے سامنے زندگی کی کو بے ہوش ہوتے، موت

کے منہ میں جاتے دیکھا۔

میری بیٹی

میری گڑیا رانی

میری آنگن کی چڑیا

تو کب دنیا پر آئی تھی

بن کر پری تو ہمارے

آنگن میں اتری تھی

تو دل کی رونق

لبوں کی مسکان تھی

تو ہمارے ہونے کا

احساس تھی

عمر تو نہیں تھی

ہم کو چھوڑ جانے کی

تو، تو کبھی ناراض نہ ہوتی تھی

پھر تو کیوں چلی گی

ماں تیری یاد میں روتی ہے

جب آس پاس دیکھتی ہوں

تیری عمر کی لڑکیوں کو

دل و دماغ کے پردے میں

تیرہ چہرہ ابھرتا ہے

دل بہت کرلاتا ہے

تیری یاد میں بہت روتا ہے

رات کو وہ اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔آنکھیں نم تھیں۔ہاتھ میں چھوٹا سا فریم تھا جس میں ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ہنستا مسکراتا چہرہ، گلاب کی طرح کھلتا ہوا، زندگی سے بھرپور۔کئی آنسو اس تصویر کی نذر ہوئے تھے۔

''بس کرو مطیہ، کیوں خود کو تکلیف دے رہی ہو۔'' رانا صاحب بالآخر بول پڑے۔تکلیف تو انہیں بھی تھی۔اولاد کا غم ان کو بھی اندر ہی اندر توڑ رہا تھا لیکن وہ اس قدر ہمت نہیں ہارتے تھے۔بیٹی کا جھلملاتا چہرہ، اس کی یاد ستاتی۔دل تڑپتا تھا۔ہمت ٹوٹتی تھی۔لیکن نئے سرے سے ہمت بناتے۔خود کو مضبوط بناتے۔

''معیز کے بابا میں کیسے بس کر دوں۔میری زندگی مجھے نہیں بھولتی۔وہ تو زندگی تھی۔پھر اتنی جلدی موت کو کیوں پیاری ہوگئی۔ابھی تو اسے بہت سارا جینا تھا۔وہ کیسے اتنی جلدی چلی گئی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ایسے جیسے یہ کل کا واقعہ ہو۔جیسے اسے کل لحد میں اتار کے آئے ہوں۔

ہر رات، ہر دن زخم تازہ ہوتا ہے

تیری یاد کا ہر لمحہ نیا لگتا ہے

''جوان اولاد کی موت پر صبر کرنا بہت کٹھن ہوتا ہے۔'' رانا صاحب بڑبڑائے۔پھر روتی ہوئی مطیہ سے تصویر لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

''مطیہ دیکھو رونے سے نہ تو اس نے واپس آ جانا ہے۔اور نہ ہی یہ رونا اس کے کام آنا

ہے۔کیا بہتر نہیں ہم اپنی بیٹی کے لیے دعا کریں۔بہتر نہیں ہم اپنے لیے سکون اور صبر مانگیں۔'' وہ انہیں کسی چھوٹے بچے کی طرح سمجھاتے ہوئے بول رہے تھے۔

آنسو تھمے، درد سی بھری سسکی۔

⁂ ...... ⁂ ...... ⁂

عالیہ کو ہوش آچکا تھا۔بہت زیادہ سٹریس لینے کے باعث اس کا بلڈ پریشر تیز رہنے لگا تھا۔خوشی اس سے روٹھ چکی تھی۔خاموش، تنہائی کو اس نے اپنا مقدر بنالیا تھا۔جب سے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ ان کی حالت زیادہ سٹریس لینے سے ہوتی ہے۔بلڈ پریشر تیز ہونے سے دماغ کی نس بھی پھٹ سکتی ہے۔اس لیے آپ انہیں زیادہ سے زیادہ خوش رکھا کریں۔تب سے طلعت بیگم نے بے چین سی بیٹھی ہوئی تھیں۔چند پل میں ہی وہ ایسی تھی جیسے بدن سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔گندمی رنگت میں زردی گھول کر ملادی ہو۔

''عالی میری جان کیا ہو گیا ہے؟کس بات کا تم نے روگ لے لیا ہے؟خوش رہا کرو میری بیٹی۔جانتی ہوناں تمہاری خوشی ہم سب کے لیے بہت معنی رکھتی ہے میری جان۔'' وہ آزردگی سے اس کے ماتھے پر پیار کرتے بولیں۔

''ماں جس کے سنگ زیست کی خوشیاں منسوب ہیں، جب وہ ہی خوش نہیں، جب وہی دن بدن زندگی سے دور ہوتا جارہا ہے تو میں کیسے خوش رہ سکتی ہوں۔میری زندگی میں خوشی کیسے آسکتی ہے؟'' بولتے بولتے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔طلعت بیگم کا دل کٹ سا گیا۔وہ جانتی تھی کہ وہ بات کس کی کر رہی تھی۔

''ماں دری کی خاموشی مجھے ماردے گی۔'' کرلاتا ہوا لہجہ۔کیسا کرب تھا اس کی آواز میں۔اندر آتی مطیعہ بیگم کے قدم چوکھٹ پر ہی جم گئے۔

”نہیں میری بیٹی ایسی باتیں نہیں کرتے۔ دیکھنا ایک دن دری ٹھیک ہو جائے گا۔“ طلعت بیگم تڑپ کر اس کے قریب ہوئیں اپنے سینے سے اسے لگا لیا۔ اسے تسلی دی۔

”وہ ایک دن کب آئے گا ماں؟ کب آئے گا؟“ اندر درد کا سمندر موجزن تھا۔

”ماں ان پانچ سالوں میں، میں خود کو بہت دفعہ کوس چکی ہوں کہ کاش مجھے پہلے پتہ ہوتا کہ وہ اس سے کتنا پیار کرتا ہے تو یقین جانیں میں اپنی جان بھی دے کر زندگی کو اس کے نام کر دیتی۔ اسے مرنے سے بچا لیتی۔ لیکن ماں میں نہیں جان پائی۔“ اس کی بات سے اندر بیٹھی طلعت بیگم کی آنکھیں نم تھیں۔ چوکھٹ سے ہٹ کر دیوار سے سہارا لیے مطیعہ بیگم کھڑی تھیں۔ وہ پھوٹ کر روتی چلی گئیں۔ پیچھے آتے رانا صاحب فوراً ان کی طرف بھاگے۔

”مطیعہ کیا ہوا؟ آپ رو کیوں رہی ہیں؟ آپ ٹھیک ہے نا۔“ وہ متفکر سے ان سے پوچھ رہے تھے۔

”معیز کے بابا! میں اپنی زندگی کو نہیں بچا پائی لیکن پلیز اس کی خوشی کو بچا لیں۔ ایک اور زندگی کو مرنے سے بچا لیں خدارا۔ میں دری اور عالی کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔“ وہ روتے ہوئے بولیں۔ رانا صاحب ان کی بے ربط باتوں کو سمجھنے نہ سمجھنے کی کیفیت میں تھے۔

”ٹھیک ہے مطیعہ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن آپ رونا بند کریں۔“ آنسو صاف کرنے کے لیے وہ ان کی طرف رومال بڑھاتے بولے تھے۔

سوچوں کی اڑان کسی اور طرف محو پرواز تھی۔ انہیں ہی اب کچھ کرنا تھا۔ ماضی کا قصہ وہ ہرگز دوہرانا نہیں چاہتے تھے۔

✿......✿......✿

پیار کے سمندر میں

ہر اترنے والے کو
کشتیاں نہیں ملتیں
دور دور تک جاناں
دھوپ کی مسافت ہے
اور کہیں بھی پل بھر کو
دھوپ کے مسافر پر
سائبان نہیں کھلتے
اس عجب سمندر میں
عمر کی ریاضت کے
بعد ہم نے جانا ہے
جس طرح فضاؤں میں
اڑنے والے پنچھی پر
برس ہا برس میں بھی
آسمان نہیں کھلتے
بحرِ بیکراں میں بھی
بھید بھید رہتا ہے
رازداں نہیں کھلتے
بام و در نہیں ملتے
داستاں نہیں کھلتے

ہر اترنے والے کو

کشتیاں نہیں ملتیں

اور مل بھی جائیں تو

بادباں نہیں کھلتے

وہ کمرے میں اندھیرا کیے صوفے پر نیم دراز تھا۔آنکھیں رونے کے باعث جھل رہی تھیں۔سر میں شدید تکلیف تھی۔دل بے قراری کی حالت میں تڑپ رہا تھا۔

”بہت ظالم ہو تم زندگی۔بہت ظالم۔کوئی اس قدر بھی اذیت دیتا ہے۔جس طرح تم مجھے دے رہی ہو۔“ وہ اپنے کرلاتے ہوئے دل کے ساتھ،خیالوں میں وہ پری چہرہ لاتے بولا۔

”تمہیں تو مجھ سے بے پناہ محبت تھی۔پھر ایسا کیوں زندگی۔جن سے محبت ہو انہیں تکلیف تو نہیں دیتے۔پھر تم نے مجھے یہ زندگی بھر کی تکلیف کیوں دے دی۔جب گئی تھی تو اپنی یادوں کا سامان بھی ساتھ لے جاتی۔یا مجھے تڑپانے کے لیے وہ چھوڑ گئی کہ دریاب مرزا کو تنگ کرتی رہیں۔“ وہ بچوں کی طرح بلک بلک رو رہا تھا۔اب درد بھرا ہجر اس سے سہا نہیں جاتا تھا۔

ایک تیرے نہ ہونے سے

یوں تو کچھ نہیں ہوتا

پھول پھر بھی کھلتے ہیں

چاندنی تو آنگن میں

آج بھی اترتی ہے

میں بھی یوں تو زندہ

سانس بھی چلتی ہے

روز شب گزرتے ہیں

عمر ڈھلتی رہتی ہے

ایک تیرے نہ ہونے سے

یوں تو کچھ نہیں ہوتا

کچھ کمی سی رہتی ہے

آنکھ کے کناروں پر

کچھ نمی سی رہتی ہے

ایک تیرے نہ ہونے سے

یوں تو کچھ نہیں ہوتا

تشنگی سی رہتی ہے

دل کے دریچوں میں

تیری یادیں رہتی ہے

آج ماضی کی یادیں، ماضی کا ایک ایک پل اس کی نم ہوتی آنکھوں سے کسی فلم کی مانند چلنے لگا۔ کچھ یادیں آپ کے دماغ میں اس قدر نقش ہو چکی ہوتی ہیں کہ جب جی چاہے ان کو پلے کر کے گزری یادوں کو تازہ کر سکتے ہیں۔ یہ فلم، ڈرامے کی طرح دماغ کی سکرین پر چلنے لگتی ہے۔ دھیرے دھیرے وہ بھی ماضی کی یادوں میں اترتا چلا گیا۔

۞......۞......۞

چند سال پہلے:

وہ جاگنگ سے واپس لوٹا تو سیدھا اپنے کمرے میں فریش ہونے چلا گیا۔ تقریباً دس

پندرہ منٹ میں وہ شاور لے کر باہر تھا۔ تبھی اس کے سماعت سے آواز ٹکرائی۔

''زندگی اٹھ جاؤ۔ میں نے تمہیں کتنی دفعہ منع کیا ہے نماز پڑھ کے یہ منحوسیت مت پھیلایا کرو۔ لیکن مجال ہے، تم میری بات سن لو۔'' مطیہ بیگم مسلسل زندگی کو اٹھاتے ہوئے بول رہی تھیں۔ جو ہمیشہ فجر کی نماز پڑھ کے دوبارہ سو جاتی تھی۔

''ماں کیا ہے؟ تھوڑا سا سونے بھی نہیں دیتیں آپ۔ اور صبح صبح ہی کتنا شور مچاتی ہیں آپ۔'' اب آواز زندگی کی تھی۔ جو نیند کی وجہ سے تھوڑا بے ڈھنگے سے انداز میں بول رہی تھی۔ شیشے کے سامنے ٹائی کی ناٹ باندھتا دریاب مرزا ہنس دیا۔

''اچھا میں شور مچاتی ہوں؟'' غصے اور افسوس بھری آواز مطیہ بیگم کی تھی۔

''ماں کیا ہے؟ دو پل آپ مجھے سکون سے سونے کیوں نہیں دیتیں۔'' جھنجلاتی ہوئی آواز۔ یقیناً مطیہ بیگم ہتھیاروں سے لیس (جوتے) میدان میں اتر چکی تھیں۔

''بدتمیز لڑکی۔ کچھ شرم و حیا ہی نہیں ہے تجھ میں۔ ماں کے ساتھ کیسے بولنا ہے ذرا سی بھی تمیز نہیں ہے۔'' وہ اسے کوس رہی تھیں اور جوتوں کے ساتھ اس کی تواضع بھی کر رہی تھیں۔ وہ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہوا جہاں اس کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے اندر کا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔

''دس منٹ میں تیار ہو کر نیچے آ جاؤ۔ ورنہ اگلے لمحے تجھے تیرے بستر سمیت گھر سے باہر نکال پھینکوں گی۔ نہیں چاہیے تیری جیسی منحوس مجھے اپنے گھر میں۔'' وہ اب سخت لہجے میں اسے دھمکی دیتے کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ وہ صبح صبح ہی اپنی اس قدر عزت افزائی سے اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ پھر شیشے کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔

''پتہ نہیں وہ کونسی مائیں ہوں گی جو اپنی اولاد کو صبح صبح پیار محبت سے اٹھاتی ہوں گی۔ ایک

میری ماں ہے جو اپنے دس نمبر جوتے کے ساتھ مجھے منحوس کہہ کہہ کر اٹھاتی ہے۔ ہائے دیکھو دیکھو لوگو، کس قدر مجھ بچاری پر ظلم ہو رہا ہے۔" اونچی اونچی آواز میں اس کی افسوس سے بھری آہ بکا جاری تھی۔ جیسے ظلم کے پہاڑ اس پر ٹوٹ گئے ہوں۔

"وہ اولاد بھی تمیز دار، سلجھی اور سمجھدار ہوگی، کم از کم تیری جیسی بدتمیز، منہ پھٹ نہیں ہوگی۔ جن کی مائیں پیار سے اٹھاتی ہوں گی۔" مطیعہ بیگم کی پھر سے آواز آئی۔

"او خدایا ایک تو یہ پاکستانی ماؤں کو پتہ نہیں اپنی اولاد میں اتنے کیڑے کیوں نظر آتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی اولاد ہی اتنی اچھی کیوں لگتی ہے؟ اپنی اولاد اتنی ہی اچھی لگتی ہے تو دوسروں کی اولادوں کو اڈاپٹ کر لینا تھا ناں آپ نے۔ ہمیں کیوں پیدا کیا؟" وہ اونچی اونچی آواز میں بول رہی تھی تاکہ آواز باخوبی مطیعہ کی سماعت تک پہنچ سکے۔

"زندگی اپنی بک بک بند کر لے ورنہ تیری زبان کو کاٹ پھینکوں گی میں۔" مطیعہ بیگم کی غصے بھری آواز پھر آئی۔ لیکن زندگی کہاں چپ رہنے والی تھی۔ وہ تو بک بک کرتی تھی تو مزید کرتی تھی۔ ابھی بھی وہ کرتی جب معیز کمرے میں داخل ہوا۔

"بس کر دو کیوں ہم سب کے کان کھا رہی ہو؟" اس کے اونچا اونچا بولنے سے وہ تنگ آ کر اس کے کمرے میں آیا تھا۔

"استغفر اللہ بھائی، میں اتنی گندی نہیں ہوں جو آپ کے کان کھاؤں گی یہ کام آپ اور آپ کے گھر والے کرتے ہوں گے۔ زندگی ہرگز نہیں۔" وہ غصے سے بولتی ہوئی پیر پٹخ کر واش روم میں گھس گئی۔

"اف۔ یہ لڑکی کبھی سدھرے گی نہیں۔" دریاب مرزا نے نفی میں سر ہلایا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹا۔ ایک طائرانہ نگاہ آئینے میں اپنے عکس پر ڈالی۔ پھر لیپ ٹاپ کا بیگ اٹھاتا

کمرے سے باہر نکل گیا۔

⁂......⁂......⁂

وہ نیچے آیا تو ناشتے کی ٹیبل پر سب گھر والے موجود تھے۔خوشگوار ماحول میں ناشتہ کیا جارہا تھا۔

''ہاں تو بیٹا جانی کیسا جارہا ہے آپ کے کالج کا تجربہ؟'' ناشتے کے دوران اشفاق مرزا نے اسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

آجکل اپنے شوق کے تحت، وہ پنجاب کالج میں ٹیچنگ کررہا تھا۔پریکٹیکل لائف میں داخل ہونے کا پہلا تجربہ تھا اس کا۔

''اچھا جارہا ہے بابا'' ناشتہ کرتے ہوئے اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''تم نے تو خوامخواہ یہ نیا شوق پال لیا ہے۔سیدھی طرح اپنے بھائی کی طرح اپنا بزنس سنبھالتے۔لیکن تم'' بات کرتے ہوئے وہ چپ ہوگئے۔انہیں اس کا اپنا بزنس چھوڑ کر ادھر ادھر نوکری کرنا پسند تو نہیں تھا لیکن اس کا شوق دیکھ کر وہ خاموش تھے۔لیکن کبھی کبھی وہ شکوہ کردیتے تھے۔

''بزنس بھی سنبھال لوں گا بابا فی الحال ابھی آپ اور بھیا سنبھال رہے ہیں ناں۔''

''لیکن بیٹا پھر بھی جب تک تم آفس نہیں آؤ گے۔بزنس کو وقت نہیں دو گے،کام کیسے کیا جاتا ہے۔تو تم اس کی باریک بینیوں کو کیسے جان پاؤ گے۔'' وہ رسانیت سے اسے سمجھاتے بولے۔

''چلیں ٹھیک ہے بابا اب کالج کے بعد آفس کا بھی چکر لگا لیا کروں گا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔''اب آپ خوش ہیں؟'' وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔اشفاق مرزا ہنس دیے۔تبھی ساتھ والے گھر سے دوبارہ شور آنا شروع ہوا۔

”لگتا ہے آج پھر مطیہ آنٹی سے زندگی کو ڈانٹ پڑ رہی ہے۔“ نادیہ ہنستے ہوئے بولی۔

”اسے ڈانٹ کب نہیں پڑتی اس کی حرکتیں ہی ڈانٹ کھانے والی ہیں۔“ دریاب بولا۔

”خوامخواہ ہی مطیہ بچی کو ڈانٹتی رہتی ہے۔ ابھی یہی تو اس کے دن ہیں کھیلنے کودنے کے۔“ طلعت بیگم نے فوراً زندگی کی طرف داری کی۔

”وہ بچی ہے یہی بات تو اس کو اور شیر بناتی ہے۔“ وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے بولا۔

”بھئی زندگی تو رونق ہے۔“ اشفاق مرزا بھی لبوں پر مسکان سجاتے بولے۔

”بابا اسے رونق نہیں ”زندگی اجیرن“ کہتے ہیں۔ جو آپکی اس لاڈلی نے سب کی کی ہوئی ہے۔“ دریاب کو ان کی بات پر کافی اختلاف تھا۔

”دری! یہ بات اگر وہ ابھی سن لے تو تیرا سر پھٹے گا یہ شرط سے میں کہتا ہوں۔“ زریاب بھائی شرارت سے گویا تھے۔

”بالکل آپ کو پتہ ہے وہ کیا کہتی ہے۔ میں زندگی ہوں اور میرا کام ہی ہنسنا، مسکرانا اور رونق لگانا ہے۔“ نادیہ نے زندگی کی کچھ دن پہلے کی بات کو اسی کے انداز میں سب تک پہنچایا جس پر سب ہنس دیے۔

”ہونہہ۔ ہنسانا، مسکرانا۔ سنجیدگی بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ جو اس میں بالکل بھی نہیں ہے۔ ہر وقت پاگلوں کی طرح ہنستی رہتی ہے۔“ وہ واحد تھا گھر میں جسے اس رونق کی حرکتوں سے سخت الجھن تھی۔

”بھئی وہ خود میں ہی چڑیا ہے سنجیدگی جیسی چڑیا کا وہ کیا کرے گی۔“ زریاب بھائی ہنستے ہوئے بولے جبکہ اٹھا اور کرسی کی پشت سے اپنا کوٹ پہنا۔

”پتہ نہیں آپ اس جوکر کو کیسے برداشت کر لیتے ہیں؟“ کوٹ کے بٹن بند کرتے بولا۔

”اللہ دری بھائی ایسے تو نہ بولیں۔“ نادیہ فوراً بولی۔اس کی بات اسے ذرا بھی پسند نہیں آئی تھی۔دریاب نے سر جھٹکا۔اس کے گھر والے تو پاگل تھے اس کے پیچھے یہ اس کا خیال تھا۔
زندگی، زندگی، زندگی یہ نام اس کے گھر کے ہر ایک فرد کی زبان پر ہمہ وقت رہتا تھا۔کون تھی یہ زندگی؟ کیا لگتی تھی ان کی؟
بظاہر تو کچھ بھی نہیں لیکن کچھ نہ ہو کر وہ بھی سب کچھ تھی۔یعنی زندگی تھی۔اپنے نام کی طرح شرارتی، نٹ کھٹ، ہنسنے، ہنسانے والی، زندگی کا ایک ایک پل جینے والی، خوشیوں کے ساتھ، مسکراہٹوں کے ساتھ۔شاید ہی دریاب مرزا نے اسے کبھی روتا ہوا دیکھا ہو۔
وہ ان کی ہمسائی تھی۔رانا صاحب آرمی آفیسر تھے۔ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے کینٹ میں گھر لے لیا جو بالکل ان کے گھر کے ساتھ ہی منسلک تھا۔جب وہ وہاں شفٹ ہوئے تب زندگی دسویں کلاس میں تھی۔جبکہ اس کا یونیورسٹی میں پہلا سال تھا۔بہت جلد ہی وہ لوگ ان میں گھل مل گئے تھے۔شفیق، ملنسار، پیار محبت کرنے والے رانا انکل اور مطیہ آنٹی بہت اچھے لگے۔ان کے پانچ بچے تھے۔سب سے بڑے معیز بھائی تھے جو زریاب بھائی کے ہم عمر تھے۔ان سے ایک سال چھوٹی عانیہ آپی تھی۔پھر معاذ تھا جو دریاب کا ہم عمر تھا اور بہت جلد ہی ان کی دوستی ہو گئی تھی۔اس کی بعد زندگی تھی۔جو نادیہ سے ایک سال چھوٹی تھی۔پھر سب سے چھوٹا اور لاسٹ پیس ارسل تھا۔
ان دونوں گھرانوں میں کچھ اس طرح کا بانڈ بن گیا تھا کہ ایسے لگتا جیسے رانا صاحب اور اشفاق مرزا دونوں بھائی ہوں۔یا پھر مطیہ اور طلعت بیگم بہنیں ہوں۔جن میں بہت پیار ہو اور زندگی تو اپنے نام کی تھی۔ہر وقت ان کے گھر میں پائی جاتی۔
”طلعت آنٹی! آپ نا مجھے میرے ماما بابا سے اڈاپٹ کر لیں۔انہیں میری قدر ہی نہیں

ہے۔" وہ اکثر منہ بسور کر طلعت بیگم سے کہتی تھی۔ وہ اس سے پیار بھی تو بہت کرتی تھیں۔ جبکہ مطیہ آنٹی کا وہ بہت سر کھپاتی تھی جس وجہ سے وہ اسے ڈانٹتی رہتی تھیں۔ تبھی اسے اپنی ماما سے بہت شکوے تھے۔ طلعت بیگم اس کی بات پر ہنس دیتیں۔

"تم میری ہی بیٹی ہو گڑیا۔" وہ پیار سے اسے کہتیں۔

"نہیں ایسے نہیں بلکہ اسٹیمپ پیپر پر لکھ کر دیں کہ آپ اپنے ہوش و حواس میں مجھے اپنی بیٹی قبول کرتی ہیں۔"

اس کی بات پر دریاب برا سا منہ بناتا اور ماما کو کہتا جو اس کی باتوں سے ہنس ہنس کر دوہری ہوتیں۔

"ماما سوچیے گا بھی مت۔ یہ خود تو پاگل ہے ساتھ میں ہم سب کو بھی پاگل کر دے گی۔"

"بے فکر رہو دریا (وہ اسے دریا ہی کہتی تھی جس پر وہ چڑتا تھا) جب تیرے جیسے خطرناک پیراسائٹ کے ساتھ رہ کر کوئی پاگل نہیں ہوا تو میری جیسی رونق کے ساتھ رہ کر بھی نہیں ہوگا۔ کیوں آنٹی میں نے ٹھیک کہا ناں؟" اپنی بات کے آخر پر وہ طلعت بیگم سے تائید چاہتی۔

"ہونہہ یہ منہ اور مسور کی دال۔" اس کی بات پر وہ جل کر خاک ہوتا۔

دریاب کی اور زندگی کی کبھی اچھی دوستی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی وہ کبھی ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ لہجے میں بات کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ اپنے سے بڑے بھائی معاذ کو اس کے نام سے بلاتی تھی تو دریاب کو بھی بھائی کہنے کا تکلف نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ مطیہ آنٹی بہت دفعہ اس کو ٹوک چکی تھیں۔ لیکن وہ زندگی ہی کیا جو کسی کی بات کو سمجھ جائے۔

وہ گاڑی لے کر جب باہر نکلا تو اسے وہ رونق (بقول دریاب کے گھر والوں کے) سفید

اور ہلکے گرے رنگ یونیفارم میں ملبوس، سیاہ بالوں کی پونی ٹیل کیے، کندھے پر گلابی رنگ کا بیگ لٹکائے مطیہ آنٹی کے ساتھ گھر کے باہر کھڑی نظر آئی۔ پھولا پھولا سا چہرہ تھا۔ مطیہ اسے کچھ کہہ رہی تھیں۔

⁂⁂⁂

دریاب نے گاڑی ان کے پاس لا کھڑی کی اور گاڑی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے اس نے مطیہ آنٹی سے سلام لیا۔

''السلام علیکم آنٹی۔ سب خیریت۔'' اس نے ایک نظر زندگی پر ڈالی جو مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''ہاں بیٹا خیریت ہی ہے۔ بس میری اس نکمی اولاد نے سکون جو نہیں لینے دینا کہ ماں کیوں نا دو گھڑی سکھ کا سانس لے۔'' وہ زندگی کو گھورتے ہوئے بولیں۔ دریاب نے اسے دیکھا۔ جو شکل کے برے برے زاویے بنا رہی تھی۔

''اف۔ میری ماں کو پتہ نہیں کونسے دکھ مل گئے ہیں میری طرف سے جو آتے جاتے لوگوں کے سامنے دکھڑے سنانا شروع کر دیتی ہیں اور اس کو دیکھو کیسے دانت نکال کر سن رہا ہے۔'' وہ دل میں ہی بولی۔

''دیکھو بیٹا اب صبح لیٹ اٹھی ہے تو وین والا چھوڑ کر چلا گیا اس کاہل لڑکی کے باعث تو اب شکل بگاڑ کر کھڑی ہے کہ میں نے لوکل نہیں جانا۔ اب بتاؤ بھلا اس کے لیے کوئی اسپیشل ہیلی کاپٹر لینڈ کرے گا جو اسے کالج تک پہنچائے گا۔'' وہ اچھی خاصی اس پر بگڑ رہی تھیں۔

''اف۔ نا جانے یہ پاکستانی مائیں کب سدھریں گی۔ اور کب یہ اپنی اولاد کی خوبیاں اوروں کے سامنے بیان کرنا چھوڑیں گی۔'' وہ اچھی خاصی کلس کر رہ گئی۔ اب بھلا کیا ضرورت

تھی۔اس کے سامنے اسے باتیں سنانے کی۔

''آنٹی! آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ میں بھی تو کالج جا رہا ہوں میرے ساتھ چلی جائے یہ۔'' وہ ان کی پریشانی کو دور کرتے بولا۔وہ بھی صرف اور صرف مطیہ آنٹی کی خاطر ورنہ تو اسے کوئی شوق بھی نہیں تھا۔اس کے کہنے کی دیر تھی زندگی میڈم خوشی حامی بھرتے بولی۔

''بالکل میں بھی یہی کہنے والی تھی آفٹرآل ہم نے ایک ہی کالج میں تو جانا ہے۔لیکن میری پیاری ماں کو مجھے کوسنے سے فرصت ملے تو وہ کچھ سوچیں نا۔'' وہ لاڈ سے ان کی بانہوں کا ہار بنتی ان کی گال پر پیار کرتی (یہ اس کی عادت چاہے ناراض ہو یا خوش وہ گھر سے انہیں پیار کر کے ہی رخصت ہوتی تھی۔بچپن کی عادت ابھی تک پختہ تھی) گاڑی کی طرف بڑھی اور فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔

''اللہ حافظ آنٹی۔'' دریاب نے مسکراتے ہوئے مطیہ بیگم کو خدا حافظ بولا اور گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

''اف۔تم کس قدر بونگے انسان ہو۔حد درجہ بور ترین۔'' جب چند پل گاڑی خاموشی سے اپنی منزل کی طرف گامزن رہی تو وہ خاموشی زہر لگی تھی اسے۔تبھی جھنجلاتے ہوئے بولی۔گاڑی چلاتے دریاب نے اسے اچھنبے سے دیکھا۔

''میڈم! آپ بھول رہی ہیں۔میری ہی گاڑی میں بیٹھ کر، میرے ہی سامنے آپ میری برائی کر رہی ہیں۔''

''نہیں مسٹر، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ویسے بھی میری ماما نے بچپن سے ہی مجھے سچ بولنے کی تلقین کی ہے۔یو نو میں بہت فرمانبردار بچی ہوں۔'' فرمانبردار بچی نے آنکھیں پٹپٹائیں۔بے یقینی سے اس فرمانبردار کو دیکھا گیا۔

”فرمانبردار اور وہ بھی تم؟“ حیرت سے بھنوئیں اچکائیں۔ بے یقینی کے ساتھ۔

”خدا کا خوف کرو محترمہ کیوں جھوٹ بول رہی ہو؟“ استہزائیہ انداز میں بولتا وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

”چل تو جل کر خاک ہوتا رہ، میں تو کوئی اچھا سا گانا سننا چاہوں گی۔“ وہ اس کی بات پر ناک سے مکھی اڑاتی، ریڈیو پلیئر سے گانے چیک کرنے لگی۔

”تمیز سے بیٹھو، گاڑی میں کوئی گانا نہیں چلے گا۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ذرا رعب سے بولا

”کیوں تم مولوی بن گئے ہو کیا؟“ وہ شرارت سے فوراً بولی۔ تبھی گاڑی میں فل والیوم سے گانے کی آواز گونجنے لگی۔

سانوں نہر والے پل تے بلا کے

ساڈی اکھاں وچوں نیندرا اڑا کے

دریاب مرزا نے ہڑبڑا کر پلیئر کو آف کیا۔ جبکہ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

”تو مولوی صاحب اس طرح کے گانے سنتے ہیں۔“ وہ ہنستے ہنستے اسے چھیڑ رہی تھی۔

”ویسے کون ہے وہ جس نے تمہیں نہر والے پل پر بلایا تھا؟“ وہ اس کو دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص شرارتی انداز میں پوچھ رہی تھی۔ بہت زیادہ ہنسنے سے اس کی ہرنی جیسی آنکھیں لبا لب بھر چکی تھیں۔

”وٹ نانسنس زندگی رانا۔ تمہیں میں نے لفٹ اس لیے تو نہیں دی تھی کہ تم میرا موڈ خراب کردو۔“ وہ جز بز سے انداز میں بولا۔ ماتھے پر کئی شکنیں پڑی تھیں۔ اس کے بلاوجہ ہنسنے پر۔

”تو دریاب مرزا آپ نے لفٹ کیوں دی تھی؟“

اس کی بات پر وہ خاموش رہا۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر بولی۔

”ایک بات تو بتاؤ تم سب کے ساتھ دانت نکال کر ہنستے ہو، میرے سامنے ہی تم سڑے ہوئے کریلے کیوں بن جاتے ہو۔ یہ بات مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ ذرا اس پر آپ روشنی ڈالنا پسند کریں گے۔“ وہ وہیں گاڑی کی سیٹ پر، دونوں ٹانگیں کیے، آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور اپنا رخ اس کی طرف کر دیا۔

اس کی اس حرکت پر وہ غصے سے آگ بھگولہ ہو گیا۔ یہ لڑکی سامنے ہو اور مجال ہے وہ غصہ نہ ہو۔ اس نے جھٹکے سے گاڑی کو بریک لگائی جس سے وہ گرتے گرتے بچی تھی۔ اس سے پہلے وہ کچھ بولتی۔ وہ وہیں سے اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

”فی الحال تو تمہیں میں اپنی گاڑی سے نکالنا پسند کروں گا۔“

وہ منہ کھولے کبھی اسے اور کبھی گاڑی کے کھلے دروازے کو دیکھتی۔

”گیٹ آؤٹ فرام مائی کار۔“ وہ غصے سے بولا۔

”اگر میں نہ جاوں تو۔“ وہ سکون سے بولی۔

”تو میں تمہیں دھکے دے کر اپنی گاڑی سے باہر نکالوں گا۔“

”تم اس قدر بدتمیز ہو گیا؟“ مصنوعی آنکھیں کھولیں۔

”ہاں ہوں میں بدتمیز۔ اب تمیز کے دائرے میں رہتے ہوئے جلدی سے دفعہ ہو جاؤ۔“ وہ اس کے دیے القاب کو قبول کرتے ہوئے بولا۔

”تم بہت ظالم ہو دریاب۔“ وہ منہ بسورتے گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔ ابھی کالج دس منٹ پیدل چلنے کی دوری پر تھا۔ اس نے اس قدر زور سے گاڑی کا دروازہ بند کیا کہ کانوں کے پردے تک ہل گیے۔ اب وہ اتنی سی بدتمیزی تو کر ہی سکتی تھی۔ اندر بیٹھا دریاب غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ پھر غصے کو قابو میں کرتے ہوئے زن سے گاڑی کو آگے بڑھا گیا۔ اور وہ

بس اسے کوستی ہوئی پیدل چلنے لگی۔

"مغرور انسان۔ ماں کہتی ہیں دریاب بہت اچھا، نیک اور سمجھدار بچہ ہے۔ اب انہیں وہ بتاتی ناں کہ آپ کی اس سمجھدار اور نیک بچے نے آدھے راستے پر ہی ان کی بیٹی کو بے عزتی کر کے گاڑی سے اتار دیا تھا۔ ساری غلط فہمیاں ہی دور ہو جاتی تھیں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی جا رہی تھی۔

"ہاہاہا۔ ان کی خوش فہمیاں دور نہیں ہونی تھی بلکہ ان کو یقین ہونا تھا کہ ان کی اولاد نے ہی بدتمیزی کی ہوگی۔" اس کے اندر کوئی بولا۔ جیسے اس کی تصحیح کر رہا ہو۔

"ہاں میری ماں کو پختہ یقین ہے کہ ان کی بیٹی ہی بدتمیز ہے۔" وہ منہ بسور کر خود کلامی والے انداز میں اعتراف کرتے بولی تھی۔

سامنے ہی اسے ہی اپنا کالج نظر آ رہا تھا۔ جو چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ پھر گھڑی پر وقت دیکھا تو ابھی کالج لگنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی چلنے لگی۔

۞......۞......۞

دریاب مرزا پنجاب کالج میں کمپیوٹر کا استاد تھا۔ اب یہ آپ خوش قسمتی سمجھیں یا بدقسمتی کمپیوٹر کا ایک لیکچر اس کو زندگی رانا کی کلاس میں بھی تھا۔

زندگی رانا بہت زیادہ ذہین طالبہ نہیں تھی۔ وہ اوسط درجے کی طالبہ تھی۔ جس کی دلچسپی پڑھائی میں کم اور شرارتوں میں زیادہ ہوتی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں ہر وقت شرارت سے جگمگاتی تھیں۔ وہ استادوں کی پسندیدہ طالبہ نہیں رہی تھی۔ وہ بس یاد کی جاتی تھی بس اپنے نام سے۔ کیونکہ وہ بالکل اپنے نام کی طرح شرارتی، نٹ کھٹ اور ہر دم مسکرانے والی تھی۔ اپنے ہنسنے ہنسانے والے چٹکلوں سے وہ ٹیچرز کو بھی باز نہیں رہنے دیتی۔

”بھئی ہم تو تو بی اے کی کلاس میں جائیں تو فریش ہو جاتے ہیں۔ زندگی رانا بی اے کی کلاس میں زندہ دل کردار ہے۔“ میم نوشین اکثر اپنی کولیگ میں بیٹھتے، مسکراتے ہوئے کہتیں۔ جس پر کچھ اور بھی ٹیچرز متفق ہوتیں لیکن دریاب مرزا کچھ بھی نہیں بولتا۔ اب وہ انہیں کیا کہتا۔ اسے تو کوفت ہوتی تھی اس لڑکی کے ہر وقت جوکروں والی حرکتوں سے۔

ابھی بھی اس وقت اس کا لیکچر تھا۔ اور وہ اپنی بھرپور، دلفریب، شخصیت کے ساتھ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ڈائس کے پاس کھڑا تھا۔ جب اس کی نگاہ تیسرے نمبر کی رو میں بیٹھی اس کوفت زدہ لڑکی پر پڑی جو کرسی کے بازوؤں پر کہنی رکھے، ہاتھ کی ہتھیلی پر چہرہ اٹکائے، اپنی نظریں اسی پر گاڑے ہوئے تھی۔

”زندگی! سر کو گھورنا بند کرو وہ دیکھ رہے ہیں تمہیں۔“ سبرینہ نے اس کی محویت کو نوٹ کرتے ہلکے سے ٹھوکا مارا۔ وہ اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ جو اس وقت بنی تھی۔ جب وہ یہاں شفٹ ہوئے۔ وہ ان کے گھر کے سامنے ہی رہتی تھی۔

”تو دیکھنے دو کمبخت کو۔ ویسے تمہیں معلوم ہے، آج اس نے مجھے اپنی کار سے گیٹ آؤٹ کیا ہے۔ اور میرا دل بہت دکھی ہے۔“ وہ دکھی لہجہ بناتے آہستگی سے بولی۔

”اور تم ان کو گھورتے ہوئے اپنا دکھ منا رہی ہو۔“ ڈپٹنے والے انداز میں اس کو دیکھتے بولی۔

”نہیں یار میں تو وہ دکھ مٹا رہی ہوں، منا نہیں رہی۔“ وہ سرگوشی کرتے بولی۔

”رول نمبر ٹوئنٹی تھری! سٹینڈ اپ۔“ اس کی پاٹ دار خاموش سی کلاس میں گونجی۔ سب سر اٹھائے، گردن گھمائے اسے دیکھنے لگے۔ جو مسلسل گردن جھکائے رجسٹر پر آڑی ترچھی لائنیں لگا رہی تھی۔ اس نے آواز کو ان سنا کیا۔

”زندگی! سر تمہیں بلا رہے ہیں۔“ سبرینہ اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر بولی۔ اس

کے نہ اٹھنے پر دریاب مرزا کو بہت طیش دلا رہا تھا۔ پھر وہ اٹھی، منہ کے ٹیڑھے میڑھے زاویے بناتے۔

''سر مائی نیم از زندگی۔ ناٹ رول نمبر ٹوئنٹی تھری۔'' وہ منہ بسورتے پر اعتماد لہجے میں بولی۔ ساری کلاس کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔

''سائلنس۔'' اس کی غصے سے بھری آواز نے سب کی ہنسی کو بریک لگائی۔

''کل جو ٹیسٹ دیا تھا آپ نے یاد کیا؟'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ جواب نہیں میں آئے گا۔ اور وہ یقین پر پورا بھی اتری۔

''نہیں۔'' صاف گوئی سے بولی۔

''کیوں؟'' اس نے وجہ پوچھی۔

''سر میں ٹھیک نہیں تھی۔'' اعتماد سے ایک ٹوٹا پھوٹا عذر پیش کیا۔ جو بہت پرانا بہانہ تھا۔

''آپ ہفتے میں کتنی دفعہ بیمار ہوتی ہیں میڈم؟'' وہ طنزاً دانت پیستے ہوئے پوچھ رہا۔ ساری کلاس ہنسی ضبط کیے سر جھکائے ہوئے تھی۔

''جتنی دفعہ آپ ٹیسٹ دیتے ہیں۔'' دوٹوک جواب۔

''بدتمیز لڑکی! جواب تو ایسے دے رہی ہے جیسے یہ کلاس روم نہیں اس کا گھر ہو۔'' وہ دل ہی دل میں بولا۔

''یہ بتائیں آپ پڑھائی کو سنجیدہ کب لیں گی۔ آپ کے والدین یہاں باتیں، شرارتیں کرنے کی فیسیں ادا کرتے ہیں یا پڑھنے کی۔'' وہ اس کو اگر شرمندہ کرنا چاہ رہا تھا وہ غلطی پر تھا۔ کیونکہ ایسا اس پر کوئی بھی اثر نہیں ہونے والا تھا۔

''سر! آج آپ کے لیکچر میں یہ ٹاپک بھی شامل تھا کیا؟'' وہ مزے سے پوچھ رہی

تھی۔مجال ہے یہ لڑکی کبھی بھی سنجیدہ ہو جائے۔

''گیٹ آؤٹ فرام مائی کلاس۔'' اس کی بات سنتے ہی اس نے غصے کے عالم میں کلاس سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔وہ مسکرائی۔پھر اپنا پین اور رجسٹر پکڑ کر کلاس سے باہر جانے لگی۔

''تھینک یو سر، ویسے بھی آج میرا آپ کی بور کلاس لینے کو دل نہیں کر رہا تھا۔'' یہ بات اس نے جاتے ہوئے اس کے پاس آ کر بہت آہستگی سے کہی کہ اس کے علاوہ کوئی بھی نہ سن سکا۔وہ ضبط کرتا رہ گیا۔دل میں آج مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ مطیہ آنٹی کو اس کی شکایت لازمی کرے گا۔

☆......☆......☆

''اف زندگی تم کیا چیز ہو؟'' سبرینہ بولی۔اس وقت بریک تھی اور وہ کالج کے کیفے میں بیٹھی چائے سموسے سے لطف اٹھا رہی تھیں۔

''آہاں چیز نہیں جانی، انسان ہوں میں۔'' اس نے چائے کا گھونٹ بھر کر اس کی تصحیح کی۔

''ہاں ہاں۔بہت بدتمیز انسان ہو۔کیسے سر کو جواب دیتی ہو شرم تو نہیں آتی تمہیں۔''

''ہاہاہا۔چلو جی مجھے بدتمیز کہنے والوں میں سے ایک اور انسان کا اضافہ ہو گیا۔واووو، گریٹ زندگی۔'' اس نے ہنستے ہوئے خود کو داد دینے والے انداز میں دائیں ہاتھ سے بائیں کندھے پر تھپکی دی۔سبرینہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں؟'' رازداری سے وہ ذرا جھک کر اسے پوچھنے لگی۔

''ہمم بتاؤ۔''

''وہ کیا ہے ناں دریاب مرزا کو دیکھ کر مجھے ٹیچرز والی فیلنگ ہی نہیں آتی تو میں شرم کیسے کر لوں۔'' وہ ڈھٹائی سے مسکراتے بولی۔

''ہاں تمہیں تو انہیں دیکھ کر بجن بجنی کی فیلنگز آتی ہے۔ تبھی ڈیلے پھاڑ کر ان کو گھورتی رہتی ہو۔'' سبرینہ نے طنز کیا اور وہ مسکرا دی۔

''ہاہاہاہا۔ جب معلوم ہے تو پوچھتی کیوں ہو۔''

''ویسے یار میں سوچتی ہوں، وہ اکڑو انسان تو مجھے ہمیشہ گیٹ آؤٹ کرتا رہتا ہے، تو اپنے دل میں کیسے مجھے گیٹ ان کرے گا۔'' تفکر بھرے انداز میں وہ ذرا غیر سنجیدہ ہوئی۔ جس پر سبرینہ قہقہہ لگاتے ہنسی۔ اپنی دوست کی بے تکی سی بات پر۔

''جانی اس کی پسند میں خود کو ڈھال لو۔ کیا پتہ پھر گیٹ ان ہونے کے چانس مل جائیں۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''اس کی پسند پتہ نہیں کیا ہے؟'' وہ پرسوچ انداز میں بولی۔

''ویسے میں کیوں خود کو بدلوں۔ جیسی میں ہوں ویسی ہی مجھے وہ پسند کرے گا۔'' فوراً اپنی سوچوں دفعہ دور کرتے وثوق سے بولی۔

''ایسا تو مر کر بھی نہیں ہوگا۔ ناممکن ہے یہ۔''

''کیا پتہ مر کر ہو جائے۔'' وہ شرارت والے انداز میں بولی۔ سبرینہ اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھتی رہ گئی۔ جہاں پر نئی نئی محبت کے جگنو ٹمٹما رہے تھے۔ اس کے شرارتی سے دل پر محبت کی کونپلیں پنپنے لگی تھیں۔ جسے وہ ہر روز امید کا پانی دیتی تھی کہ دریاب مرزا اگر اس کے دل میں براجمان ہوا ہے تو وہ اسی کا ہوگا۔ اس بات سے بے خبر کی قسمت میں اس کے کیا لکھا ہوا ہے۔

اے زندگی تھوڑا سا بے خبر رہنے دے

تھوڑا سا خوش گماں رہنے دے

حقیقت ذرا تلخ سی ہے اے زندگی

تھوڑا خوابوں میں مجھ کو رہنے دے

کچھ سچائیاں لے لیں گی جان میری

تھوڑا سا مجھ کو انجان رہنے دے

ابھی تو کچھ سفر اور بھی کرنا ہے

تھوڑا سا مجھ کو جی لینے دے

✡......✡......✡

دریاب مرزا سے نوک جھونک کرتی، اس کو تنگ کرتی، اس کو چڑاتی، کب اس کے دل میں محبت گیت گانے لگی اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

میٹھا میٹھا سا احساس

بہاروں کے جیسا

پھول کی خوشبو جیسا

رنگ برنگی تتلیوں جیسا

بارش کی بوندوں جیسا

نرم نرم سا یہ احساس جاگنے لگا اور وہ روزانہ اس جذبے میں سرشار ہوتی، بے خود ہوتی، دل کی دھڑکنیں رقص کرتیں، اور وہ بے خودی کے عالم میں اسے دیکھتی رہتی۔ کبھی کلاس روم میں، تو کبھی کوریڈور سے گزرتے ہوئے، کبھی معیز کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے، جاگنگ کرتے، ایکسرسائز کرتے۔ لیکن وہ اس کے دل میں پیدا ہونے والے جذبے سے انجان تھا۔ کیونکہ اس کی شرارتیں اس جذبے پر غالب آجاتی تھیں۔ ایک سبرینہ تھی اس کی واحد دوست جو اس کے دل کا حال جانتی تھی۔ جو اس کی ہم راز تھی۔

اتوار کا دن تھا۔اور وہ دن چڑھے سوتی رہی۔بارہ بجے کے قریب وہ اٹھی اور نیچے آئی۔جہاں صغراں بی بی (دادی) لاؤنج میں ایک طرف رکھے اپنے تخت پر بیٹھیں نظر کی عینک لگائے، جو ناک کی نوک پر رکھے۔کوئی سلائیوں سے سفید دھاگے کے ساتھ ناجانے کیا بنا رہی تھیں۔وہ لاؤنج کے ساتھ منسلک کچن میں داخل ہوئی۔

''ماما میرا ناشتہ۔''

کچن میں کام کرتی مطیہ بیگم اس کی طرف مڑیں اور خونخوار نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''دفعہ ہو جاؤ یہاں سے، ناشتہ دوں میں تجھے۔زہر نہ دے دوں تجھے۔''

''ماں کیا ہو گیا ہے؟'' وہ ان کے بگڑے تیور دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔وہ کافی غصے میں لگ رہی تھیں اور اسی غصے میں اسے کچن سے نکال باہر کیا۔وہ ناسمجھی والی کیفیت سے باہر دادی کے پاس رکھی ایک کرسی پر ٹک گئی۔

''دادی! ماں کو کیا ہو گیا ہے صبح صبح بہت غصے میں لگ رہی ہیں۔''

اس کی بات پر انہوں نے اسے دیکھا جو ابھی تک کچن کی کھڑکی سے مطیہ بیگم کو دیکھ رہی تھی۔انہوں نے سلائیاں ایک طرف رکھیں اور اپنے پاس پڑی لاٹھی اٹھا کر اس کی کمر پر رسید کر دی۔

''ہائے......ہائے۔'' ہڑبڑائی، درد بلبلائی، کمر سہلاتے ہوئے اس نے دادی کو دیکھا جن کے تیور بھی کسی خطرے سے کم نہیں لگ رہے تھے۔

''وقت دیکھا ہے تم نے حرام خور'' اپنی ناک پر اٹکائے چشمے سے وہ جھانکتے ہوئے جارحانہ انداز میں بولیں۔

''جا جا کر دوسروں کے گھروں میں دیکھ، کبھی کسی کی بہن بیٹی اس وقت تک سوتی ملی تو

بتانا، خوف خدا کا کوئی شرم وحیا ہی نہیں تجھ میں۔ تیری ٹانگ جتنی لڑکیاں گھر کے سارے کام کرتی ہیں اور ایک تو نکھی ہے جو سارا سارا دن ادھر ادھر تا نکا جھانکا کرتی رہتی ہے۔ مجال ہے ماں کے ساتھ ہاتھ ہی بٹادے۔'' دادی بھری پڑی تھیں۔ تبھی لاوا برسا رہی تھیں۔

''اف۔ خدایا! اتنی لمبی تقریر، دادی کتنا وقت لگا اسے رٹنے میں؟'' وہ بھی اپنے نام کی تھی مجال ہے جو ذرا بھی شرمندہ ہو۔ دادی کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

''تو کبھی نہیں سدھر سکتی، دفعہ ہو جا میری نظروں سے دور۔ ورنہ میں اپنا ہی سر پھاڑ بیٹھوں گی۔''

''اووو خدایا! دادی یعنی آپ خودکشی کریں گی۔'' حیرت سے اپنی خوبصورت آنکھیں پھیلائیں۔

''دادی! آپ کو نہیں معلوم خودکشی حرام ہے۔ ایسا سوچیے گا بھی مت۔'' وہ انہیں تنبیہہ کر رہی تھی۔ جیسے دادی کوئی کم سن بچی ہو۔

''کمبخت، دفعہ ہو جا یہاں سے۔'' داد جھنجلائیں۔

''ایک تو پتہ نہیں آپ سب کو مجھ معصوم سے مسئلہ کیا ہے؟ ہر کوئی بس مجھے ہی دفعہ کرنے پر تلا ہوا۔ جب ہو جاؤں گی دفعہ تب قدر ہو گی میری۔'' وہ پاوں پٹختے ہوئے اٹھی۔ کچن سے مطیعہ بیگم بھی ہاتھ صاف کرتے نکلیں۔

''اور دادی ویسے تو آپ کہتی ہیں آپ سے زیادہ بولا نہیں جاتا لیکن مجھے اگر ایک گھنٹہ بھی ڈانٹیں گی تو آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔ نہ سر میں درد نہ ہی زبان میں درد۔ یہ کام آپ بہت شوق سے کریں گی۔'' آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے وہ جھگڑ رہی ہو۔

''دیکھیں اس کی زبان کیسے قینچی کی طرح چلتی ہے۔'' مطیعہ بیگم نے ایک جھانپڑ اس کی کمر

پرسید کیا۔

''کیا میں اتنی فالتو ہوں؟ جو آپ لوگ مجھے مارتے رہتے ہیں۔'' وہ منہ بسور کر کمر سہلاتے بولی۔اس سے پہلے مطیہ بیگم کچھ بولتیں۔دریاب مرزا سلام کرتا لاؤنج میں داخل ہوا۔

''آنٹی معیز گھر پر ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''نہیں بیٹا، وہ صبح سے کہیں نکلا ہوا ہے۔کچھ کام تھا کیا؟'' انہوں نے بتاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ دوست آئے ہوئے ہیں تو اس کا پوچھ رہے تھے۔فون کیا تو وہ بند جا رہا تھا تو میں نے سوچا گھر پتہ کرتا ہوں۔'' اس نے وضاحت دی۔پھر اجازت لیتا وہاں سے چلتا بنا۔اتنے سے وقت میں اس نے زندگی کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا جو مطیہ بیگم کے ساتھ کھڑی تھی جبکہ زندگی نے اس سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔

''مہارانی صاحبہ آپ کہاں چلی اب؟'' اسے باہر جاتا دیکھ کر مطیہ بیگم پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

''جہاں بھی جاؤں آپ کو اس سے کیا۔'' وہ بغیر ان کی طرف دیکھے باہر نکل گئی اور مطیہ بیگم تاسف سے سوچ کر رہ گئیں کہ یہ لڑکی کب سدھرے گی۔ان کے گھر کا انوکھا پیس تھا وہ۔جس کا نام تھا زندگی رانا۔

❁.......❁.......❁

''نادی! تمہارا بھائی سمجھتا کیا ہے خود کو، شوخا کہیں کا۔'' وہ نادیہ سے بولتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی جہاں وہ اور عالیہ کام کر رہی تھیں۔

''بھائی نے اب کیا کر دیا ہے زندگی؟'' مصروف سی نادیہ اس پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

''اپنے دوستوں کے سامنے مجھے ڈانٹ کر رکھ دیا ہے۔اب مجھے کیا معلوم تھا اس کے دوست کھلے عام یہاں وہاں گھوم رہے ہوں گے۔'' وہ کافی غصے میں لگ رہی تھی۔

”چلو چھوڑو کچھ نہیں ہوتا، تمہیں پتہ تو ہے بھائی کی عادت کا۔“ نادیہ نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔

”نہیں مجھے تم یہ بتاؤ۔ وہ کہتا ہے مجھے تمہیں شرم نہیں ہے۔ خود تو جیسے شرم کے اس نے جام پیئے ہوئے ہیں ناں، بدتمیز انسان لڑکیوں سے بات کیسے کرنی ہے، عقل ہی نہیں، ویسے یہ کالج پڑھاتا ہے۔“ وہ بول رہی تھی۔ غصے سے۔ اب اس کا غصہ نکلنا تو تھا۔

”تم اپنا والیوم آہستہ نہیں رکھ سکتی۔“ وہ کچن کی دہلیز پر کھڑی تھی جب وہ اس کی بلند ہوتی بک بک کو سن کر وہاں آیا۔ اس کی بات پر وہ اچھل کر مڑی۔ عالیہ اور نادیہ بھی ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”اف، یہ انسان پتہ نہیں مجھے دیکھ کر انگارے کیوں چبانے لگ جاتا ہے۔“ اس نے سوچا۔

”نہیں رکھ سکتی کر لو جو کرنا ہے۔“ بات تو وہ کسی کی مانتی نہیں تھی۔

”جاؤ جا کر پھر اپنے گھر میں گلا پھاڑو، ہمارا سر نہ کھانے آجایا کرو، مہربانی ہوگی۔“ وہ دانت پیستے ہوئے تقریباً ہاتھ جوڑنے والے انداز میں بولا۔

”میں تمہارے گھر نہیں آتی۔ یہ میرے انکل آنٹی کا گھر اور دماغ کھانے کا پیشہ تمہارا ہوگا میرا نہیں۔“ وہ ناک منہ چڑھاتے بولی۔ پھر اس کی نظر دریاب کے ایک دوست پر پڑی جو کچن کے سامنے لیونگ روم کی دہلیز پر کھڑا اس کو دیکھتے ہوئے بتیسی نکال رہا تھا۔

”اور تم لوگ یہاں مہمان آئے ہو تو مہمان بن کر رہو۔ ادھر ادھر تانکا جھانکی مت کرو۔ اور تم مجھ پر تو بڑے لیکچر جھاڑتے ہو اپنے دوستوں کو بھی تمیز سکھاؤ۔“ وہ اس کو بولتے ہوئے دریاب سے مخاطب ہوئی۔ وہ بیچارہ تو اپنی سی شکل لے کر اوجھل ہو گیا۔

”اپنی حد میں رہو زندگی۔“ وہ درشتی سے بولا۔ تبھی طلعت بیگم وہاں آئیں۔

”کیا ہو گیا ہے دریاب؟“

”ماما!! اپنی اس لاڈلی کو کچھ سمجھائیں۔ عقل نام کی چیز نہیں ہے اس لڑکی میں۔“

”ہاں ساری عقل تو اس کے پاس آ گئی ہے۔ بڑا آیا عقل مند۔“ وہ کسی بات کا جواب نہ دے ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

”اوہو بس کرو جب دیکھو تم دونوں جھگڑتے رہتے ہو۔ جاؤ دری اپنے دوستوں کے پاس جا کر بیٹھو۔“ وہ دریاب کو وہاں سے جانے کا کہہ خود زندگی کی طرف بڑھی۔

”کیا ہو گیا ہے میری بیٹی اتنے غصے میں کیوں ہے؟“ وہ پیار سے اس کے بالوں کو سنوارتے بولیں۔

”آپ کا بیٹا ہے اس کی وجہ۔ گھر سے ماں اور دادی کی ڈانٹ سن کر آئی، یہاں پر آپ کے بیٹے نے اپنے دوستوں کے سامنے جھاڑ پلا دی۔“ وہ منہ بسور کر بولی۔ بیچارگی سے۔

”ہائے میں صدقے واری۔ ہر کوئی میری بیٹی کو ہی ڈانٹتا رہتا ہے۔ فکر نہیں کرو دری کی تو میں اچھی خاصی کلاس لوں گی۔“

”تو ماں اور دادی کی کلاس کون لے گا؟“ اس کی بات وہ تینوں مسکرائیں۔

”آہ یہ کلاس تھوڑی سی مشکل ہے۔ اس لیے اچھی خاصی تو نہیں لے سکتی۔ بس تھوڑی سے لے لوں گی۔“ وہ شرارت سے بولیں۔ ان کی بات وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

”آنٹی آپ بہت اچھی ہیں بہت زیادہ۔“ وہ ان کے سینے سے لگتی۔ پیار کا اظہار یونہی کرتی تھی ہمیشہ سے۔

⁂……⁂……⁂

کالج میں اس کے ہفتے وار ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ جس کی وہ بہت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت محنت تو کر رہی تھی۔ اس لیے اس کا زیادہ آنا جانا پچھلے تین چار دنوں سے مرزا ہاؤس بند ہوا

تھا۔آج وقت نکال کر ادھر رخ کیا تھا۔وہ لاؤنج میں بیٹھی طلعت بیگم سے مل کر وہ عالیہ اور نادیہ کے مشترکہ کمرے میں آئی۔

''ساجن جی گھر آئے ......دلہن ہوں شرمائے۔'' نادیہ کی کھنکتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

وہ کاؤچ پر بیٹھی، ساتھ ہی اس کے انعمتہ بھابھی اپنے دو سالہ بیٹے کو لیے بیٹھی تھیں۔سامنے عالیہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''اوہو کس کے ساجن آرہے ہیں بھئی۔'' وہ شوخی سے بولتے ہوئے عالیہ کے پاس بیٹھ گئی۔

''ارے شکر ہے زندگی تم نے بھی اپنا دیدار کروایا ورنہ مجھے تو شک ہو رہا تھا کہ کہیں لڑکی پیا کو پیاری تو نہیں ہو گئی۔'' انعمتہ بھابھی اس کو دیکھ کر شرارت سے گویا ہوئیں۔

''ہاہاہا۔بھابھی ہماری ایسی قسمت کہاں۔ویسے یہاں پر کس کے سجن آرہے ہیں؟ کچھ ہمیں بھی تو بتائیں۔ہم چند دن نظروں سے اوجھل کیا ہوئے لوگوں نے ہمیں پرایا ہی کر دیا۔'' وہ شکوہ کرتے بولی۔

''ارے ارے لڑکی کسی نے تمہیں پرایا نہیں کیا۔'' نادیہ فوراً بولی۔

''چلو جی مان لیتے ہیں اور نادی کہیں تمہارے ساجن صاحب تو نہیں اٹلی سے آرہے۔'' وہ شرارت سے اس کو چھیڑتے ہوئے اصل مدعے پر آئی۔

''آہاں میرے نہیں۔عالیہ کے ساجن صاحب کی تشریف آوری ہونے والی ہے۔'' نادیہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''واٹ۔'' وہ جھٹکے سے عالیہ کی طرف مڑی۔جو شرمیلی مسکان لیے بیٹھی تھی۔

”عالی۔او خدایا۔ کیا یہ سچ ہے؟“ خوشی کے مارے وہ چیخی پھر اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر جوش سے بولی۔

”کون ہے وہ خوش قسمت انسان؟“ وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔

”اور کون ہو سکتا ہے۔اپنے دری بھائی ہیں خوش قسمت۔“ نادیہ نے چہکتے ہوئے بتایا۔

”میں بہت خوش ہوں آج بہت زیادہ۔“ نادیہ کے چہرے سے ہنسی جدا نہیں ہو رہی تھی۔لیکن اس کی بات نے کسی کی ہنسی کو پل میں جدا کر دیا تھا۔وہ سیدھی ہوئی۔آنکھیں حیرت سے منجمد ہوئیں۔ہونٹوں پر جو دلکش مسکراہٹ تھی وہ رخصت ہوئی۔دھڑکنوں نے شور کرنا بند کیا، جیسے وہ خاموش رہ کر یقین کرنا چاہ رہی ہو۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ مرے مرے لہجے میں وہ یقین دہانی کر رہی تھی۔

”بالکل یہ سچ ہے۔آج ہی بابا نے فیصلہ کیا ہے دریاب بھائی اب نوکری کر رہے ہیں تو ان کی شادی کر دینی چاہیے۔عالیہ اور ان کی بات تو شروع سے ہی طے تھی تو پھر عالی کی بھی پڑھائی ختم ہو گئی ہے تو بابا نے کہا دیر کس بات کی دونوں کو جلد ہی ایک بندھن میں باندھ دینا چاہیے۔“ نادیہ نے ہلکے پھلکے انداز میں تفصیل بتائی۔وہ خوش تھی بے پناہ۔خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔وہاں واقعی خوشی کا سماں تھا۔لیکن اس کا دل طوفانوں کی زد میں یوں آیا کہ اسے سب کچھ گھومتا ہوا نظر آیا۔سانس لینا دشوار ہونے لگا۔

یہ کیا کہہ رہی تھی نادی۔دریاب مرزا۔کسی اور کا۔یہ کیسے ہو سکتا تھا۔وہ شخص جس کے ساتھ لڑائی ہونے کے باوجود دل کا مکین بنا تھا۔وہ تو اس کا تھا ہی نہیں۔آنکھوں کی پتلیاں نم ہونے لگیں۔اس کا دم گھٹنے لگا۔اس سے پہلے اس کا دل بند ہو جاتا وہ یکدم اٹھی۔

”ارے زندگی کہاں جا رہی ہو؟“ وہ بھاگنے کے سے انداز میں کمرے سے باہر نکلی جب

بھابھی نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ سنی ان سنی کرتی بھاگتی گئی۔ نادیہ کے لفظوں کی بازگشت جاری تھی۔ من بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں برس رہی تھیں۔

"اتنی جلدی جا رہی ہو زندگی۔" اسے جاتا دیکھ کر طلعت بیگم نے پوچھا۔

وہ لڑکی جو مرزا ہاؤس سے جانے کا نام نہیں لیتی تھی۔ آج ایک لمحہ بھی وہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان کو، ان کی بات کو نظر انداز کرتی لاؤنج پار کر گئی۔ پیچھے وہ استعجاب سے اس کو جاتا دیکھتی رہ گئیں۔ سر جھکا، آنکھیں دھندلائیں۔ تبھی باہر سے آتے دریاب سے زبردست تصادم ہوا۔ اس سے پہلے وہ زمین بوس ہوتی، دو مضبوط بانہوں نے اپنے حصار میں لے لیا۔

"کیا تم دیکھ کر......" اس سے پہلے وہ اپنی بات مکمل کرتا۔ اس کی نگاہ۔ اس کی نین کٹوروں سے بھری پر پڑی، گہرا سمندر جو اچھل اچھل کر باہر آنے کو بے تاب تھا۔ وہ تھم چکا تھا۔ بھول گیا کہ اس وقت وہ اس کے کتنے قریب تھا۔ بس اسے وہ اشکوں سے بھری آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ جو شاید ہی اس نے ان میں آنسو دیکھے تھے۔ وہ تو مسکراتی آنکھیں تھیں۔ پھر۔

ہوش تو اسے تب آیا جب وہ اس کے حصار سے نکلتی وہاں سے بھاگتے ہوئے ان کی دہلیز پار کر گئی۔

"اسے کیا ہوا آج؟" وہ حیران تھا۔ ذرا مضطرب ہوا۔ پھر دل میں اٹھنے والی کیفیت کو جھٹکتا ہوا وہ اندر بڑھ گیا۔

❂......❂......❂

اپنے قدموں پر وہ واپس گھر، اپنے کمرے تک کیسے پہنچی یہ صرف وہی جانتی تھی۔ دل تھا کہ یقین ہی نہیں کر رہا تھا لیکن کانوں نے جو سنا آنکھوں نے جو دیکھا وہ کیسے جھٹلا سکتی

تھی۔ ہنستی مسکراتی زندگی یکبارگی مرجھا سی گئی۔ اس دن اس کی خاموشی سب گھر والوں کو کھٹکی تھی۔ سب حیران تھے کہ اسے ہوا کیا۔ وہ آج اتنی خاموش کیوں ہے؟ لیکن وہ تو اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوششوں میں تھی کہ جو وہ سن چکی ہے وہی حقیقت ہے۔

پھر ایک دو دن میں اپنے ہی گھر میں اس کی شادی کا آئے روز ذکر سنتے یقین پختہ ہو گیا۔ دل کرچی کرچی کر کے ٹوٹا۔

محبت میں اکثر یہ حال ہوتا ہے
کوئی روتا ہے، کوئی ہنس دیتا ہے
محبت کے دریا میں اترنا آسان نہیں
کوئی تر جاتا ہے کوئی ڈوب جاتا ہے

اس دن اپنے کمرے میں بند، اندھیرا کیے وہ خوب روئی۔ زاروقطار۔ محبت رولا رہی تھی۔ جس کو وہ چاہتی تھی وہ کسی اور کا ہونے جا رہا تھا۔ یہ بات اس سے برداشت کرنا مشکل تھا۔

''زندگی! میں تمہیں باہر بلا رہی ہوں اور تم یہاں سرِ شام لیٹی ہوئی ہو۔'' مطیہ بیگم بولتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں لیکن وہ سر نیچے لیے سوتی بنی۔

''زندگی اٹھو۔ طلعت آپا باہر آئی ہوئی ہیں۔ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔'' وہ اس کے پاس آ کر بولیں لیکن دوسری طرف ہنوز کوئی ردعمل نہیں ہوا۔

''لگتا ہے سو گئی ہے۔'' وہ بڑبڑائیں۔ پھر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اس بات سے انجان کہ ان کی بیٹی کس دکھ میں گر چکی تھی۔ ناسور دکھ۔ کبھی نہ بھرنے والا۔

......۞......۞......

اس کی شادی ہو رہی تھی۔ اس کی رضامندی سے۔ عالیہ سے شادی کا فیصلہ سراسر والدین کا تھا اور اس نے تابعداری سے سر جھکا دیا۔ کوئی خاص پسند تو اس کی تھی نہیں۔ عالیہ اچھی تھی۔ سلجھی ہوئی، خوش شکل، اچھے اخلاق والی۔ وہ اس کے اکلوتے ماموں کی بیٹی تھی۔ بہت چھوٹی تھی جب ماں باپ چل بسے اور وہ ان کے گھر رہنے آ گئی۔ اور طلعت بیگم کو اپنے اکلوتے بھائی کی اکلوتی نشانی بہت عزیز تھی۔ تبھی تو اسے نگاہوں سے دور نہ جانے دیا اور اس کی رضامندی سے اپنے خوبرو بیٹے کے ساتھ منسوب کر دیا۔

شادی کو دو ہفتے رہ گئے تھے اور گھر میں زور و شور سے تیاریاں چل رہی تھیں۔ آئے روز خواتین کے بازار کے چکر لگ رہے تھے۔ مطیعہ بیگم بھی بھرپور ان کا ساتھ دے رہی تھیں لیکن اس دوران اس نے ایک بار بھی زندگی کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس کی آواز سنی۔ نہ اس کی جھلک دیکھی۔ دریاب کو نا جانے کیوں اس دن کا منظر یاد آ گیا۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں۔ پاس ہی مطیعہ آنٹی طلعت بیگم کے ساتھ کوئی بات کر رہی تھیں جب بھابھی نے ان سے استفسار کیا۔

”آنٹی! یہ زندگی کہاں ہوتی ہے آجکل؟ نظر ہی نہیں آ رہی ٹھیک تو ہے۔“

”بالکل ٹھیک ہے اسے کیا ہونا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔ دریاب قدرے فاصلے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا لیکن کان ان کی طرف ہی لگائے ہوئے تھے۔

”اللہ۔ آنٹی یہ زندگی آجکل کچھ زیادہ ہی عجیب نہیں بنی ہوئی ہے۔ اپنی عادت کے برخلاف خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ کہیں آپ نے زیادہ سیریس والا تو نہیں ڈانٹ دیا۔“ نادیہ بولی۔

”ارے بیٹا وہ پہلے کب میری ڈانٹ کو سنجیدہ لیتی ہے۔ ایسے بات کو اڑاتی ہے جیسے میں اس کی سہیلی ہوں۔ اور مذاق کر رہی ہوں اس سے۔“ ان کی بات پر تینوں خواتین مسکرا دیں۔

دریاب مرزا بھی ہلکا سا مسکرا دیا۔ وہ جہاں نہیں ہوتی۔ وہاں بھی اس کا ذکر ہوتا تھا۔ عجیب لڑکی تھی۔ ہر کسی کو گرویدہ بنائے ہوئی تھی۔

⚝......⚝......⚝

یک طرفہ محبت میں ایک سزا ہے جو اذیت کے سوا کچھ نہیں۔ کاش تم میری خاموش محبت کو سمجھ سکتے۔ تمہاری محبت نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ کاش میری آنکھوں میں اپنے لیے دیوانگی دیکھ لیتے۔

تم کسی اور کے ہو جاؤ یہ سوچ ہی میری دھڑکنوں کو شکنجے میں لے لیتی ہے۔ تم سے محبت کرتے ہوئے تو کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ تم کسی اور کے ہو سکتے ہو۔ محبت بھلا یہ کب سوچنے دیتی ہے۔ وہ تو اپنے حصار میں اس طرح قید کرتی ہے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم کر دیتی ہے۔ کاش میں تمہیں اپنا دل دکھا سکتی، جہاں اس وقت درد کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر میرے سینے میں قید ہے۔

دریاب مرزا میں تمہیں کھو رہی ہوں۔ کیسے یقین کر لوں کہ تم کسی اور کی زندگی بن رہے ہو۔ میں نے تمہیں چاہا ہے۔ دریاب۔

اپنے درد کو لفظوں کی زبان دیتے صفحہ قرطاس پر اتار رہی تھی۔ آنسو بھی گالوں سے لڑھکتے ہوئے صفحوں پر گرتے اور وہاں سے قلم کی روشنائی کو پھیلا دیتے۔ دل آہ بکا میں مصروف۔ وہ وہی ڈائری پر سر رکھے۔ منہ بازوؤں کے ہالے میں چھپائے، چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

⚝......⚝......⚝

شام ڈھل چکی تھی۔ رات کی سیاہی نے اپنی جگہ لینی شروع کر دی تھی۔ بارش تھی کہ طوفان

تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کھڑکی سے ٹکراتی بارش کی بوندیں ماحول میں عجیب سا شور پیدا کر رہی تھیں۔ بیڈ پر چت لیٹی وہ چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی سبرینہ بیٹھی ہوئی تھی جو اس کی آنکھوں میں بہتے آنسو کو دیکھ کر گہرے دکھ میں گھر گئی تھی۔

یہ محبت ہنستے مسکراتے انسان کو رلا کر رکھ دیتی ہے۔ بہتے ہوئے آنسو میں گزرا ہوا لمحہ لہرانے لگا۔ یخ بستہ سردی میں ہونے والی بارش، وہ طلعت آنٹی کے لان میں بغیر سردی کی پرواہ کیے بارش کا مزہ لے رہی تھی جبھی اسے بھی اپنے ساتھ لیے لان میں نکل آئی۔

''تم پاگل ہو زندگی، خود تو مرو گی مجھے بھی مارنے کا ارادہ ہے کیا؟'' وہ اس کی حرکت پر کھل کر رہ گیا۔ وہ ایسی ہی تھی، لاپرواہ سی۔

''اوہو۔ ایک تو تمہاری یہ چھوئی موئی والی عادت سے میں سخت تنگ ہوں۔ نہیں مرتے تم ذرا سا بھیگنے سے۔'' وہ اس کے غصے کو نظر انداز کرتے بولی۔ وہ سر جھٹک کر وہاں سے چلا گیا اور وہ مزے سے بارش کو انجوائے کرتی رہی۔ وہ دن یاد کر کے ایک دفعہ پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔

''سبرینہ! میں مر جاؤں گی اس کے بغیر۔ میں کیا کروں؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے بولی۔ سبرینہ نے آگے بڑھ کر ریزہ ریزہ بکھرتی اس خبطی لڑکی کو اپنے ساتھ لگایا۔

وہ اس کی ہم راز، اس کی دوست تھی۔ جو اس کے دل میں ابھرنے والی محبت، پھر اس دکھ کے بارے میں جانتی تھی۔ اس کے دل میں چھپی محبت، اور اب دل میں اٹھنے والے درد سے آشنا تھی۔

''بس کرو زندگی، تمہیں دیکھ کر مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔'' سبرینہ کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔

’’پتہ نہیں سبی، مجھے اس سے کیسے محبت ہوگئی۔تم جانتی تو ہو وہ کبھی بھی مجھ سے اچھے انداز میں بات نہیں کرتا لیکن پھر بھی یہ پاگل دل...... اپنے اندر بسایا بھی تو اس شخص کو جو مجھے سخت ناپسند کرتا ہے۔ایسا کیوں ہوا سبرینہ کیوں۔وہ میرا کیوں نہیں ہوسکتا؟‘‘

سبرینہ خاموش تھی۔کیا جواب دیتی۔وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ اس کی پیاری دوست کو کیسے محبت نے اپنے روگ میں لپیٹ لیا ہے۔

’’زندگی!تم ایسی تو نہیں ان چند دنوں میں تم نے خود کا کیا حال بنا دیا ہے۔جانتی ہو سب کتنا پریشان ہیں۔تمہاری یہ خاموشی سب کو کھٹک رہی ہے۔‘‘وہ اس کے آنسو پونچھتے بولی۔جو بار بار گالوں پر لڑھک آتے تھے۔

’’سبی!میں کہتی تھی میں زندگی ہوں۔خوش رہنے والی ہنسنے مسکرانے والی۔لیکن یہ بھول گئی تھی زندگی تو خوشی اور دکھ کا امتزاج ہے۔پھر مجھے کیسے دکھ نہ ملتا۔میں نے زندگی میں خوشی کو محسوس کیا۔دکھ کو قدموں تلے روند دیا اور اب مجھے یہ دکھ اپنے اندر لیے میرے وجود کو کرچی کرچی کر رہا ہے۔‘‘وہ کرلاتے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ان تین چار دنوں میں اس نے جس قدر آنسو بہا دیئے تھے۔زندگی میں شاید ہی ایک بھی بہایا ہو۔

’’دکھ مجھ سے بدلہ لے رہے ہیں۔‘‘رونے کے باعث آواز بھاری ہوچکی تھی۔

’’زندگی مت رو یار۔دنیا میں دریاب بھائی سے بھی اچھے لوگ ہیں۔ان شاء اللہ تمہیں ان سے بھی اچھا ہمسفر ملے گا۔‘‘وہ اپنی پیاری سہیلی کو محبت سے بہلاتے بولی۔

’’سبی بہت سے اچھے ہوں گے لیکن ان میں دریاب تو نہیں ہوگا نا جس سے میں محبت کرتی ہوں۔وہ تو صرف ایک ہے۔جو صرف اور صرف عالیہ کے بخت کا ستارہ ہے۔‘‘کتنی حسرت تھی اس کے اندر۔وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہورہی تھی۔سبرینہ بس دیکھتی رہ گئی اور وہاں

بیٹھے بیٹھے اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔جس پر اس نے بہت سوچ بچار کی تھی۔اپنی دوست، ہنستی مسکراتی زندگی کی خاطر۔اس کی خوشی کی خاطر۔

۞......۞......۞

''میں تمہیں کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔لیکن مجال ہے میری آواز بھی تم سن لو۔'' مطیہ بیگم نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا جو خاموشی کی تصویر بنی لاوئنج میں بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔

شام کا وقت تھا سب گھر والے بیٹھ کر گپ شپ کر رہے تھے۔

''کیا تکلیف ہے تمہیں۔کیوں خاموش ہو۔بات کا جواب کیوں نہیں دیتی؟'' مطیہ بیگم اس کی خاموشی پر کھول اٹھی تھیں۔تبھی غصے سے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''کیا ہے ماما؟ آپ کسی حال میں بھی خوش نہیں ہیں۔جب بولتی ہوں تب بھی آپ کو مسئلہ ہوتا ہے اور اب جب خاموش ہوں تب بھی آپ کو سکون نہیں ہے۔آخر آپ دعا کیوں نہیں کرتیں کہ میں مر جاؤں تا کہ آپ سب خوش ہو جائیں۔'' وہ ماں کے جھنجوڑنے پر چلا اٹھی۔آنکھیں بھی ساتھ برسنے لگیں۔سب ششدر سے اس کے اس قدر سخت ردعمل کو دیکھنے لگے۔ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔سب گھر والوں کو اس کی بات پر سانپ سونگھ گئے۔

''زندگی۔'' ماں تڑپ اٹھی۔باپ نے پکارا۔دادی کے نحیف سے چہرے پر حیران تھا۔بھائی بہن سب استعجاب میں گرے۔

''کیا یہ ان کی زندگی تھی؟ کیا یہ لہجہ، یہ نم آنکھیں اس کی تھیں؟''

''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ وہاں سے روتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی جب معیز بھائی سب کو حیرت میں چھوڑ کر اس کے پیچھے لپکے۔

”یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔تمہیں کیا ہوا ماں یہی تو پوچھ رہی تھیں۔تمہارے اس رویے کی وجہ جان سکتا ہوں۔“

”بھیا پلیز میں کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہتی۔“ چہرہ موڑ کر بولی۔

”گڑیا! تمہیں ہو کیا گیا ہے۔کسی نے کچھ کہا ہے؟“ وہ نرم پڑے۔تشویش سی ہوئی۔

”پلیز، آپ لوگ پریشان ہونا بند کریں مجھے کچھ نہیں ہوا۔اور آپ جائیں یہاں سے مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“ رونے سے اس کا گلا روندھ چلا تھا وہ بدتمیزی سے بولتی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔معیز بیچارہ اس کے رویے پر غور کرتا، حیران ہوتا کمرے سے باہر نکل گیا۔پریشانی تو لازمی بنتی تھی۔ایک لڑکی جو زندہ دل، ہنس مکھ، شرارتی، باتونی، ہر وقت غیر سنجیدہ حرکتوں کی ملکہ جب اس طرح اچانک بغیر کسی وجہ کے اس طرح کا انداز اپنائے گی تو پریشان ہونا تو بنتا تھا۔

❁......❁......❁

آج بہت دنوں بعد وہ دشمن جان اس کے سامنے تھا۔ان کے گھر کے لان میں، اس کے سامنے بیٹھا بات کرنا چاہ رہا تھا۔وہ یک ٹک اس کو دیکھ رہی تھی۔بے خودی کے عالم میں۔وہ اس کا اب بھی نہیں تھا لیکن وہ اسے دیکھ سکتی، چپکے چپکے نظر اتار سکتی تھی لیکن یہ صرف چند دن کے لیے تھا۔بعد میں تو وہ کسی اور ہو جانے والا تھا۔کسی اور کی زندگی بننے والا تھا۔اسے لگتا تھا جیسے بعد میں اس کا کوئی حق نہیں رہنا تھا اسے خاموش محبت کرنے کا بھی۔آنکھیں نم ہونے لگیں۔دل بے چین کو قرار ہی نہیں تھا۔

”یہ کیا طریقہ ہے زندگی۔جانتی بھی ہو تم کیا کر رہی ہو؟“ دریاب کو اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر، اپنے لیے دیوانگی دیکھ کر، سبرینہ کی باتوں پر یقین ہو چلا تھا۔

سب گھر والے اس کی خاموشی سے آخر پریشان ہو چکے تھے۔ مرزا ہاؤس والے اسی شش و پنج میں تھے یکدم اس کو کیا ہو گیا۔ نہ وہ کسی کو کچھ بتا رہی تھی، نہ ہی کسی کے پاس بیٹھتی تھی۔ سب پوچھ پوچھ کر تھک چکے تھے لیکن دوسری طرف کوئی ردعمل نہ پا کر سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کے لب خاموش تھے لیکن اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر دل کا حال بتا رہی تھیں۔

''زندگی! میری بات سنو۔ جس راستے پر تم چل رہی ہو وہ ٹھیک نہیں ہے۔'' اس کی خاموشی کاٹ دینے کو تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ پاگل لڑکی اس کی محبت میں بہت دور نکل گئی تھی۔ جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ لبوں پر قفل لگ چکا تھا۔ جب آنکھیں حال دل افشاں کر دیں تو لفظوں کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اسے ڈانٹنا چاہتا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ ان کے درمیان ایسا خوشگوار تعلق کب بنا جس نے اسے اس سے محبت کرنے پر مجبور کر دیا لیکن وہ چاہ کر بھی اپنا لہجہ سخت نہ کر سکا۔

اسے اپنا دل ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا۔ اگر وہ ایک لمحہ بھی اس کے سامنے بیٹھا تو واقعی سب ہار جائے گا۔

''دریاب۔'' اٹھتے قدم تھمے۔ اس کی پکار پر۔ دنیا جہاں کا کرب جیسے اس میں سما گیا تھا۔ وہ اس کا نام کبھی بھی ٹھیک نہیں لیتی تھی لیکن آج نام لیا بھی تو اس انداز میں کہ دریاب ٹھٹک گیا۔ جسم میں جیسے سنسنی سی دوڑ گئی ہو۔ اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''یہ سچ ہے میں نے تمہیں چاہا ہے دل و جان سے۔ لیکن سبرینہ نے تمہیں بتا کر اچھا نہیں کیا۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ قسمت کے فیصلے کا ماننا بہت مشکل ہے دری۔ میں تمہیں بھول تو نہیں سکتی اور یہ بھی نہیں کہوں گی کہ تمہیں بھولنے کی کوشش کروں گی۔ کیونکہ یہ میرے اختیار

میں نہیں ہے۔ میں مر جاؤں گی لیکن تمہیں دل سے نہیں نکال سکتی۔ میرے لیے دعا کرنا دری کہ مجھے سکون مل جائے کیونکہ زندگی کا سکون ختم ہو گیا ہے۔'' آنکھیں برس کر گالوں کو بھگو رہی تھیں اور یہی وہ لمحہ تھا جب دریاب مرزا کو ان برستی آنکھوں میں اپنا دل گم ہوتا محسوس ہوا۔ سارا غصہ، سارا رعب دھرے کا دھرا رہ گیا۔ وہ جو سوچ کر آیا تھا کہ آج اس کی طبیعت صاف کر کے رکھ دے گا ایسی جسارت پر...... اب اس کے برعکس اپنا دل ہار بیٹھا تھا۔

زندگی اگر بدل گئی تھی تو یہی وہ پل تھا جب دریاب مرزا کے دل کی دنیا بھی تہس نہس ہو گئی تھی۔ پھر وہ چلی گئی۔ شکستہ قدم اٹھاتی وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور کئی پل اس راستے کو دیکھتا رہا جہاں سے وہ گزر کر گئی تھی۔

عجب بے سکون لیے وہ وہاں سے آیا تھا۔ سبرینہ کے کہنے پر وہ اسے سمجھانا چاہتا تھا لیکن اپنا دل اس کے پہلو میں ہی کہیں چھوڑ آیا اور اسے پتہ بھی نہ چلا۔

ایسا تو ہم نے چاہا نہیں تھا
کوئی ہم کو اس طرح چاہے گا
کوئی آنسو بہائے
ہمارے لیے کوئی تڑپ رکھتا ہو
ایسا تو ہم نے چاہا نہیں تھا
دل تو ہمارا ہے
اسے کسی اور کو دینے کا
سوچا ہی نہیں تھا
وہ لمحہ بھی آیا

چشم نم تھیں کسی کی

دل پہلو میں دھڑک رہا تھا جو

اٹھتے ہوئے اسی کے پاس چھوڑ آئے

ان برستی آنکھوں کو ہم بسا لائے

ہم ہم نہیں رہے

اور خود کو وہیں چھوڑ آئے۔

❁......❁......❁

رات کو وہ چپکے دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ مطیہ بیگم کے پاس آئی۔ جو بے خبر نیند کی وادی میں اتری ہوئی تھیں۔ بیڈ کے دوسری طرف رانا صاحب لیٹے سو رہے تھے۔ اس نے دونوں کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ آنکھیں تو پہلے رونے کو تیار رہتی تھیں۔

اک محبت نے اس قدر بدل دیا ہم کو

خوشیوں کی مدت ختم ہوئی

ہنسنے کے دن تمام ہوئے

وہ ماں کے پائنتی والی طرف بیٹھ گئی۔ مطیہ بیگم نیند سے گھبرا کر اٹھیں۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑے لیمپ کو آن کیا۔

''زندگی۔'' وہ اس کی طرف بڑھیں جو زار و قطار رو رہی تھی۔

''کیا ہوا میری بچی؟'' وہ تڑپ ہی تو اٹھیں۔ ماں ہزار بچوں کو ڈانٹے، ان سے بیزاری ظاہر کرے لیکن ماں ماں تھی۔ اولاد کی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی۔

”ایم سوری ماں۔ایم سوری میں بہت بری ہوں ناں۔بہت بری۔ہمیشہ آپ کو تنگ کرتی ہوں۔“ وہ سسکتی ہوئی ان کے سینے سے لگی۔رات کے خاموش اندھیرے میں اس کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔رانا صاحب بھی اٹھ چکے تھے۔اس کے رونے سے وہ دونوں میاں بیوی بہت پریشان ہو گئے تھے۔

”نہیں جان ایسا کس نے کہا؟ میری بیٹی تو بہت اچھی ہے۔ہمارے گھر کی رونق، ہماری زندگی ہو۔“ وہ پیار سے بولیں لیکن اس کے رونے میں کمی نہ آئی۔بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔وہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ آخر اس کو کیا ہوا۔

”میں اچھی بیٹی نہیں ہوں ناں ماما۔“ سسکتا ہوا لہجہ۔ماں کو حال دل اپنا بتا نہیں سکتی تھی۔معافی مانگنے کی آڑ میں وہ رو کر دل ہلکا کر رہی تھی۔

”کس نے کہا میری بیٹی اچھی نہیں۔ذرا مجھے بتاؤ تو سہی میں اچھی طرح اس کی کلاس لوں گا۔“ رانا صاحب بھی اس کے پاس آئے۔وہ ماں سے الگ ہوئی تو انہیں دیکھا۔آنکھیں رو رو کر سوجھ چکی تھیں۔

”کیا ہوا میری بیٹی کو؟“ باپ کو شدت کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔تفکر سے آ سے، پوچھا۔آنسوؤں سے بھری آنکھیں صاف کیں۔

”کچھ نہیں بابا۔مجھے کیا ہونا ہے؟“ وہ آنکھیں صاف کرتے بولی۔

دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔پھر وہ چپ چاپ وہاں سے نکل گئے پیچھے ان کو شش و پنج میں چھوڑ کر۔

”مطیہ! کیا میں جان سکتا ہوں۔تم نے زندگی کو کیا کہا؟“ وہ ان سے پوچھ رہے تھے۔انہیں شک ہوا۔

"میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" وہ خود ہی کشمکش میں تھیں لیکن اگلے ہی دن اس کے کمرے کی صفائی کرتے ان کی کشمکش دکھ میں بدل گئی۔ اپنی بیٹی کے دکھ میں شریک ہو گئیں۔

✿......✿......✿

آخر وہ دن بھی آ گیا اپنی آب و تاب کے ساتھ۔ سب گھر والے خوش تھے۔ ہر طرف رنگ، خوشبو، قہقہوں، مسکراہٹوں کا سماں تھا۔ دوست یار اس کو چھیڑ رہے تھے اور وہ سپاٹ چہرہ لیے، بے چین دل کی دھڑکن کو سنبھالتا، جہاں اس شادی کے حوالے سے کوئی امنگ کوئی خوشی نہیں رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے بار بار اسی کا چہرہ جھلملا جاتا۔ کیسی عجیب بات تھی ناں اپنی ہی شادی والے دن اس کو اس لڑکی کا خیال ستا رہا تھا جس کو وہ کبھی ناپسند کرتا تھا......اور اب۔

وہ خود کو کتنی دفعہ کوس چکا تھا۔ اپنی اس حرکت پر لیکن بے اختیار ہی اس کا خیال اس کے دل دماغ میں غالب آنے لگتا۔ وہ بھی وہاں آئی ہوئی تھی۔ بلیک اور گولڈن میکسی میں، لائٹ سا میک اپ کیے۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بظاہر مسکرا رہی تھی لیکن آنکھوں کے کونے نم تھے۔ کئی دفعہ تو وہ چپکے سے صاف کر بیٹھی۔ رو رو کر اس کے دماغ کی رگیں جیسے درد سے پھٹ رہی تھیں۔

دور کھڑی مطیبہ بیگم اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ آہ زندگی، یہ تم نے کیسا روگ پال لیا میری بیٹی۔ جہاں دکھ کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملنے والا۔ میں کیسی ماں ہوں جو اپنی بیٹی کے دل پر بیتنے والے غم کو نہ جان سکی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں غلطاں تھیں جب طلعت بیگم نے انہیں بلایا۔

نکاح کا وقت تھا سب سٹیج کے قریب کھڑے تھے۔ وہ دلہا بنے بہت پیارا لگ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی اس کے پہلو میں گھونگھٹ نکالے بیٹھی عالیہ بھی کسی اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ وہ

سبرینہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ آنکھوں پر لاکھ بند باندھتی کہ وہ اس طرف نہ دیکھیں لیکن نادان دل بے اختیار ہی اس کو دیکھنے کو ہمکنے لگتا۔

نکاح خوانی ہو رہی تھی۔ تبھی دو نگاہوں کا ٹکراؤ ہوا۔

چاہا تھا جس کو ہمیں

ہونا تھا اسے کسی اور کا

دل پھر بھی بے چین ہے

نگاہیں پھیرنے پر راضی نہیں

نکاح کے کلمات ادا ہوئے۔ آنسو تمام بند توڑ کر باہر نکلنے کو تیار تھے۔ جس کو وہ شدت سے چاہتی تھی وہ اس کے سامنے ہی چند قدم کے فاصلے پر بیٹھا کسی اور کا ہونے جا رہا تھا۔ اس کا دل کر رہا ہے تھا چیخ چیخ کر روئے۔ سارے آنسو ایک ساتھ بہا دے۔ کس قدر بے بس تھی وہ۔

دل کی دھڑکنیں الگ ہی ڈگر پر بھاگنے لگیں۔ دونوں فریقین سے ایجاب و قبول ہوا۔ ہر طرف شور اٹھا، مبارک باد دی جانے لگی۔ خوشی سے سرشار جگمگاتے چہرے۔ گلے مل رہے۔ اور وہ شل ہوتے دماغ کے ساتھ وہیں کھڑی رہی۔ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ فضا میں جیسے آکسیجن کی کمی ہونے لگی۔ سبرینہ اسے کچھ کہہ رہی تھی لیکن کان کو کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ اس کے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ تمہاری محبت ہار گئی۔ تم ہار گئی۔ تیرا محبوب کسی اور کا ہو گیا۔ یہ اندر سے اٹھنے والی بازگشت نے جیسے اسے مجسمہ بنا دیا۔ ٹانگوں پر کھڑا رہنا مشکل ہوا اور کرچی کرچی ہوتے دل کے ساتھ وہ بھی وہیں بکھرتی چلی گئی۔ آنکھوں سے سارے رنگ کھونے لگے۔

سبرینہ اسے گرتے دیکھ کر چلائی۔ دوستوں سے بات کرتا دریاب پریشانی سے بھاگتا ہوا

اس کے پاس پہنچا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے گرد بھیڑ جمع ہو گئی۔

خوشی یکبار ماند پڑ گئی۔

''زندگی۔'' اس کا سر اپنی گود میں رکھتے وہ بولا۔

اس کی رنگت زردی میں گھل گئی۔ ہونٹ سوکھے پتے کی طرح مرجھا گئے۔ وہ بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ جو پریشانی سے اس کو پکار رہا تھا۔

وہاں سب اسے پکارنے لگے۔ زندگی۔ زندگی کی پکار شروع ہو گئی۔ جس میں پریشانی، تفکر، ڈر......اور خوف تھا۔ اس بات سے انجان کہ زندگی موت میں اتر رہی ہے۔

''ہاسپٹل لے کر جانا ہو گا۔ معیز بھائی! جلدی گاڑی نکالیں۔'' اس کو بے ہوش ہوتا دیکھ کر وہ چلایا۔ پھر اسے بانہوں میں اٹھاتا باہر کو بھاگا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ ماں روتی بلکتی پیچھے لپکی۔ فضا میں یکدم گھٹن ہونے لگی۔ ہر چہرے پر یاسیت سی چھانے لگی۔ باہر آسمان پر بادل بننے لگے۔ ہوا چلنے لگی تھی۔ بادل گرجنے لگے۔ جیسے ابھی برسنے کو تیار ہوں۔ بجلی کی لہر کے ساتھ ساتھ بادل گرجتے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیز و تند ہوا کے جھونکے کے ساتھ بادل بارش میں بدلتی دھرتی کو سیراب کرنے لگی۔

ریش ڈرائیونگ کے ساتھ وہ دس منٹ میں نزدیکی ہاسپٹل لے کر پہنچے تھے۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ دریاب مرزا کی اس کی حالت دیکھ کر جیسے جان نکل رہی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی ایمرجنسی ٹریٹمنٹ دیا جانے لگا۔

سب کے لبوں پر اس کے لیے دعا تھی۔ زندگی کی زندگی کے لیے۔ اس کے ٹھیک ہو جانے کے لیے۔ مطیعہ بیگم کا رو رو کر برا حال تھا۔ سب گھر والے وہاں پہنچ چکے تھے۔ سبرینہ بھی وہاں تھی۔ دریاب کو آئی سی یو کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا دیکھا تو اس کے پاس چلی آئی۔

''یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے، صرف آپ کی وجہ سے دری بھائی۔ اگر زندگی کو کچھ ہوا تو آپ اس کے قاتل ہوں گے۔'' وہ غصے سے سب کا لحاظ کیے بغیر اس پر چلائی۔ خدا کے بعد ایک وہی انسان تو تھی جو اس کے دل پر بیتنے والے حال کو جانتی تھی۔

''نہیں میں کچھ نہیں ہونے دوں گا اس کو۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' بے تاثر آنکھیں۔ کھویا سا لہجہ۔ سب پریشانی میں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ تبھی ڈاکٹر باہر آئے اور وہ دیوانوں کی طرح ان کی طرف لپکا۔

''ڈاکٹر! وہ ٹھیک تو ہے ناں۔ اسے ہوش آ گیا۔ وہ بے ہوش کیوں ہوئی تھی؟'' ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔

''دیکھیں مریض کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھنے کے باعث ان کے دماغ کی نس پھٹ چکی ہے۔ ہمیں آپریشن کرنا ہوگا اگر چوبیس گھنٹے تک انہیں ہوش آ گیا تو...... اگر ہوش نہ آسکا تو ان کے بچنے کے چانس مشکل ہیں۔ بس آپ دعا کریں۔'' وہ ان سب کے سروں پر دھماکہ کرتے جانے لگے۔ جب اسے ہوش آیا اور ان کی طرف بھاگا۔

''ڈاکٹر! دیکھیں میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ پلیز ڈاکٹر کچھ کریں اسے ہوش میں لائیں جیسے بھی کریں بس اسے ٹھیک کر دیں۔'' وہ ان کے سامنے التجا کرتا رو رہا تھا۔ ہاتھ باندھے ہوئے۔ دل تڑپ رہا تھا۔

''آپ اللہ سے دعا کریں۔ ٹھیک کرنے والا تو وہ مالک کائنات ہے ہمیں تو اس نے وسیلہ بنایا ہے۔ آپ دعا کریں کہ وہ ہماری کوششوں کو کامیاب کر دے۔ بے شک وہ دعائیں سننے والا ہے۔'' ڈاکٹر نرمی سے اسے کاندھے کو تھپکتے وہاں سے ہٹ گئے۔

وہاں بیٹھے اس کے سب عزیزوں کا روم روم دعاؤں میں مدہوش تھا۔ مطیہ بیگم شیشے کے

پار اپنی زندگی کو موت سے لڑتا دیکھ رہی تھیں۔ چند لمحوں میں سارا خون جیسے نچوڑ کر نکال دیا گیا۔ یہ سب خواب کی طرح لگ رہا تھا بھیانک خواب کی طرح۔ آنکھوں کے سامنے ہنستی، کھلکھلاتی زندگی کا چہرہ دوڑنے گیا۔ صبح اٹھانے پر برے برے منہ بناتی زندگی، بابا سے لاڈ اٹھاتی زندگی، محلے کے بچوں سے کھلتی ہوئی زندگی، مرزا ہاؤس کی طرف جاتی ہوئی زندگی، دریاب سے لڑتی ہوئی زندگی، ماں سے پیار کرتی ہوئی زندگی۔ ان کی زندگی ایسے کیسے کچھ ہو سکتا تھا۔

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ دریاب بھی ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ نظریں اندر بیڈ پر لیٹی اسی وجود پر تھیں جو دو دن پہلے اس کے سامنے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ کس قدر اس کی آنکھوں دیوانگی تھی اور لہجے میں تڑپ تھی۔

''تم ایسے بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی زندگی۔'' وہ بڑبڑایا۔ مطیبہ بیگم نے چونک کر اسے دیکھا۔ جس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔

''تمہیں بہت چاہتی ہے دری۔'' ماں کا دل کرلایا۔ اس نے انہیں دیکھا۔

''ہمیں معلوم ہی نہیں ہونے دیا اور اندر ہی اندر تمہیں کھونے کا غم سہتی رہی۔ اور دیکھو تمہیں کھونا وہ برداشت ہی نہیں کر سکی۔'' وہ اندر بیڈ پر لیٹے اس کے وجود کو دیکھتے تڑپ رہی تھیں۔

''دعا کرو دری ہماری زندگی ٹھیک ہو جائے۔'' انہوں نے التجائیہ نگاہوں سے اس کو دیکھا۔ وہ کچھ نہ بول سکا۔ لب جامد ہو چکے تھے۔ پھر وہ وہاں سے ہٹتا چلا گیا۔

وضو کر کے ہاسپٹل کے پریئر روم میں آ گیا۔

وہ خدا کے سامنے رو رہا تھا۔ اس کی زندگی کی التجا کر رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کی زندگی کی بھیک

مانگ رہا تھا جس کو نا چاہتے ہوئے بھی وہ چاہنے لگا تھا۔ وہ اس وقت یہ بھول گیا تھا کہ اس کے نکاح میں کوئی اور لڑکی تھی لیکن نہیں اسے تو اس وقت بس یہی یاد تھا جو اس دل میں بسی ہے وہ اس وقت زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے۔

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ جب ڈاکٹر نے اس کی موت سندیسہ سنایا۔ زندگی اور موت کی جنگ لڑتی، وہ زندگی سے ہار گئی۔ موت سرخرو ہوگئی۔ ہاسپٹل کی در و دیوار چیخوں سے کانپ اٹھیں۔ ماں تو یہ سنتے ہی غش کھا کر گر گئی۔ دریاب مرزا نے بے یقینی سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ آپ جھوٹ بول رہیں ڈاکٹر کہہ دیں کہ یہ جھوٹ......'' وہ ان کو جھنجوڑتے ہوئے بولا۔

''خدا آپ کو صبر دے۔'' وہ پروفیشنل لہجے میں بولتے اپنا گریبان چھڑواتے بولے۔ وہ اندر کی طرف بھاگا۔ جہاں وہ بے خبر ابدی نیند کی وادیوں میں اتر چکی تھی۔

''زندگی! اٹھو یار، یہ سب کیا ہے۔ تم ایسے میرا امتحان کیوں لے رہی ہو؟ ایک دفعہ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ میری آنکھوں میں دیکھو زندگی۔ جانتا ہوں تم بہت مذاق کرتی ہو لیکن ایسا مذاق مت کرو یار۔ میری جان نکل جائے گی۔'' روتے ہوئے اس پر جھکا۔ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو بے سود تھا۔ اس کے چہرے پر کرب، تکلیف کی جگہ سکون نے لے لی تھی۔ ابدی سکون۔

وہ دیوانی اس کو دیوانہ بنا کر خود آنکھیں موند چکی۔ روح جب جسم سے جدا ہوتی ہے تو سارے غم، سارے دکھوں سے چھٹکارا پا کر جسم بھی سکون میں آ جاتا ہے۔

وہ رو رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ اسے اپنی قسم دے کر اٹھا رہا تھا۔ لیکن وہ کہاں اس کی سن رہی تھی۔ وہ کسی کی بھی پرواہ کیے بغیر، بلند چیخوں کے ساتھ رو رہا تھا۔ اسے ہوش ہی کب تھا۔ اس

کے تو دل کی دنیا ہی لٹ چکی تھی۔

"مجھے اتنی بڑی سزا نہ دو زندگی۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔" کسی نے پکڑ کر اسے اس سے الگ کیا۔ اس کے پرسکون چہرے کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔

کچھ ہی دیر میں اس کی میت کو رانا ہاؤس کے لان میں اتارا گیا۔ ہر طرف آہ و بکا شروع تھا۔ صفِ ماتم بچھ چکا تھا۔ ہر آنکھ نم تھی۔ ماتم کناں ماحول تھا۔ ماں، باپ، بھائی، بہن سب اپنی زندگی سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔ بوڑھی دادی بین کر رہی تھی۔

"زندگی میری جان۔ میری پیاری بیٹی۔ ماں کو ایسے تنگ مت کرو۔ اٹھ جاؤ۔" ماں رو رہی تھیں۔ رانا ہاؤس کی در دیوار میں ان کی کرب ناک چیخوں پر تو رو رہی تھیں۔ وہ کبھی اس کے سر منہ کو چومتی۔ ہاتھ پکڑتیں۔

جوان موت پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ چند لمحے بعد میت کو غسل دلایا گیا۔ مطیہ بیگم بار بار بے ہوش ہو رہی تھیں۔

"زندگی! اس کو پہننے کی تو تیری عمر نہیں تھی۔ میرے حصے کا یہ کفن تم نے کیوں پہن لیا میری بیٹی۔" کفن میں لپٹے اس کے وجود کو دیکھ کر دادی کا نحیف وجود کرلایا۔ رو رو کر آنسو خشک ہو چکے تھے۔ گلاب کے پھولوں، عطر کی خوشبو نے ماحول کو سوگوار بنا دیا گیا۔ اس کے پاس کھڑے ہو کر دعائیں پڑھی گئیں۔ کلمے پڑھے گئے۔

سبرینہ اس کے پائینتی کی طرف کھڑی تھی۔ آج اس کی سہیلی اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی تھی۔ نظر بھر کر اس کو دیکھ رہی تھی۔ کلمہ پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو لڑھک گئے۔ نادیہ، عالیہ، طلعت بیگم سب کی نگاہیں سفید کفن میں لپٹے اس کے چہرے پر تھیں۔ جو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہونے والا تھا۔ ہمیشہ کے لیے۔

کسی نے کب یہ سوچا تھا وہ اتنی جلدی ان کو چھوڑ کر چلی جائے گی۔ موت جب آتی ہے تو یہ نہیں دیکھتی کہ انسان کس کا کتنا لاڈلا ہے۔ کس کے لیے کتنا اہم ہے۔ یہ تو بے رخی سے انسان کو اپنے اندر اتار لیتی ہے۔ پھر کوئی جتنا مرضی روئے، تڑپے، ایڑیاں رگڑے واپس نہیں آ سکتا۔ ہر ایک کو موت آنی ہے۔ ہر ذی روح کو اس کا مزہ چکھنا ہے۔ یہی تو اٹل حقیقت ہے۔

آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے چند لوگ آئے۔ کسی کی بھی تڑپنے کی پرواہ کیے۔ میت کو اٹھا لیا گیا۔ وہ چار کندھوں پر وہ اپنے اصل گھر جانے لگی۔

"کلمہ شہادت۔" مولوی صاحب کی آواز بلند ہوئی۔

"نہیں میری زندگی کو مت لے کر جاؤ۔" ماں ان کے پیچھے لپکی۔ عورتوں نے انہیں پکڑا۔ ان کی نگاہوں سے، گھر سے دور، بہت دور۔ اسے جاتا دیکھتی رہ گئیں۔ وہ بے ہوش ہو کر وہیں لڑھک گئیں۔

✲.......✲.......✲

مرنے والا تو مر جاتا ہے لیکن زندہ رہنے والے اس کے جانے کے غم میں کرلاتے رہتے ہیں۔ کچھ دکھ کم مدت کے ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ تا عمر ساتھ رہنے والا دکھ جان کا روگ بن جاتے ہیں۔

تین دن ہو گئے تھے اسے دنیا سے گئے ہوئے۔ وہ مسلسل صبح قبر پر آتا اور سارا سارا دن دیوانوں کی طرح اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا۔ ایسے جیسے وہ اس کے سامنے ہو۔ اس کی باتیں سن رہی ہو۔ وہ روتا رہتا اس کو یاد کرتا۔ سب گھر والوں کو اس کی حالت زار سے اس کا حال دل پتہ چل چکا تھا۔ سب چپ تھے۔ دکھ میں تھے اور کہیں پچھتا رہے تھے کہ ہمیں علم کیوں نہ ہو سکا۔

وقت کا کام تھا بیتنا...... اور بیتتا چلا گیا۔ کوئی کس حال میں ہے وہ یہ نہیں دیکھتا۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔

وہ گھر جاتا تو اسے ایسے لگتا جیسے وہ ابھی کہیں سے آجائے گی۔ اسے تنگ کرے گی اسے چڑائے گی۔ لیکن وہ نہیں آتی تھی۔ پھر اس کی یادوں سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے یہاں سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔ لیکن بے سود...... جگہ بدلنے سے دل نہیں بدلتے اور نہ ہی اس میں بسنے والوں کی یادیں ختم ہوتی ہیں۔

سبرینہ نے اس کو اس کی ڈائری دی تھی جس پر اس کی داستان محبت لکھی تھی۔ ہر صفحے پر دریاب نامہ رقم تھا۔ اپنا حال دل لفظوں میں بیان کیا ہوا تھا۔ اس کی روٹین تھی وہ روزانہ اس کی وہ ڈائری کو دیکھتا آج بھی وہ ڈائری اس کے پاس تھی۔

کچھ اس قدر تم کو ہم چاہیں گے

مر بھی جائیں تو تیرے دل میں رہیں گے

اس کی ڈائری کے آخری صفحے پر یہ لکھا شعر وہ بار بار پڑھتا اور سوچتا یہی تو سچ تھا۔ وہ اس کے روم روم میں بس چکی تھی۔ اس کی موت نے یہ احساس دلایا کہ وہ کس قدر اس کو چاہنے لگا تھا۔ اپنی محبت کے سوگ میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے کوئی اس کے ساتھ منسوب ہو چکا ہے۔ ماں ہر دفعہ اس کو سمجھاتیں، منتیں کرتیں۔ لیکن وہ خاموش رہتا۔

زندگی کی موت کے بعد اس نے جیسے بولنا ہی چھوڑ دیا۔ ہر لمحہ تو وہ اس کی یادوں میں کھویا رہتا۔ ہنسنا وہ بھول چکا تھا۔ ساری باتیں، ساری ہنسی جیسے بس ایک وجود کے ساتھ منسوب تھیں۔ جس کے اوجھل ہوتے ہی سب اوجھل ہو گیا تھا۔

......

وہ آج سالوں بعد وہاں آیا تھا۔نظروں کے سامنے اس کی قبر تھی۔جس کے کتبے پر نام لکھا ہوا تھا۔"زندگی رانا" سن پیدائش اور یوم وفات کی تاریخ رقم تھی۔تازہ پھولوں کی خوشبو،اگربتی کی مہک اردگرد بکھری ہوئی تھی۔وہ وہیں ڈھے گیا۔چند پل وہ خالی نگاہوں قبر کو دیکھتا رہا۔توقف کے بولا۔

"آج پانچ سال گزر گئے ہیں اور میں وہیں ہوں زندگی جہاں تم چھوڑ کر گئی۔خود تو یہاں سکون سے لیٹی ہو لیکن میری زندگی تو جامد کردی ہے تم نے۔بہت ظالم ہو تم۔ذرا بھی مجھ پر ترس نہیں آتا نہ تمہیں۔نہ اللہ کو۔بہت دعا کرتا ہوں سکون مل جائے کہیں۔لیکن نہیں مل رہا۔میں خالی ہاتھ ہوں۔واقعی یک طرف محبت بہت اذیت ناک ہے زندگی۔لیکن میری محبت یک طرفہ نہ ہو کر بھی یک طرفہ ہے۔تمہاری یاد لمحہ لمحہ میرے اندر سرایت کررہی ہے۔میں کیا کروں کہیں بھی چین نہیں ہے مجھ کو۔" وہ آج عرصے بعد بلک بلک کر رو رہا تھا۔ وہ کئی پل سر جھکائے روتا رہا جب کندھے پر کسی کا لمس محسوس ہوا۔اس نے سر اٹھایا۔آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔رانا صاحب اس کے پاس کھڑے تھے۔انہوں نے دعا مانگی اور اسے اپنے ساتھ آنے کا کہا۔قبرستان کے باہر پڑے بینچ پر وہ بیٹھ گئے۔

"دریاب!یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے بیٹا؟ کیوں کررہے ہو ایسا؟ سب تمہارے لیے پریشان ہیں۔" وہ تفکر بھرے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔اس نے ان کو دیکھا جیسے پوچھ رہا کیا آپ نہیں جانتے میری حالت کا سبب۔سر جھکا گیا۔دو موتی ٹوٹ کر زمین پر گرے۔اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے بولے۔

"وہ چلی گئی ہے کبھی نہیں آئے گی تمہاری یہ حالت بھی اس کو واپس نہیں لاسکتی بیٹا اس کے برعکس اس کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔جو مر جاتے ہیں ان کے لیے دعا کرتے ہیں اگلی منزل

کے لیے آسانیاں پیدا کرتے ہیں نہ کہ ان کو روکر مزید تڑپایا جاتا ہے......اور نہ ہی مرنے والوں کے لیے خود کو اپنے آس پاس کے لوگوں کو فراموش کیا جاتا ہے۔کہیں ایسا نہ ہو وہ بھی اسی کی طرح تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں اور تم بے خبر رہ جاؤ۔" انہوں نے اسے دیکھا جو بغور ان کی بات سن رہا تھا۔

" وہ روزانہ اپنی ماں کے خواب میں آتی ہے اور ایک ہی بات کہتی ہے ماما میرا دری خوش نہیں ہے۔وہ روتی ہے سسکتی ہے دری۔" اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔جن کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

" بیٹا! میں یہ نہیں کہوں گا اس کو بھول جاؤ ضرور یاد رکھو اسے......لیکن اپنے ساتھ منسوب رشتوں کو بھی تو مت بھولو۔اس دن عالیہ کی حالت دیکھ کر مجھے اپنی زندگی یاد آ گئی۔ایسے لگا جیسے ایک اور زندگی ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے۔تمہاری بے رخی،تمہاری لاپرواہی نے اس بچی کو اس حالت میں پہنچا دیا ہے دری۔یہ اچھا نہیں ہے۔ابھی بھی وقت ہے جو ہاتھ میں ہے اس کو جانے مت دو۔اسے بکھرنے سے پہلے سمیٹ لو۔یہ نہ ہو تم ایک اور زندگی کی موت کا پچھتاوا لے بیٹھو۔" وہ اس کو سمجھا رہے تھے۔وہ ان کی باتوں کو سمجھ بھی رہا تھا۔واقعی اپنی محبت کے سوگ میں سب کو نظرانداز کر گیا تھا۔

رانا صاحب نے اسے کسی بچے کی طرح اپنے ساتھ لگایا۔جیسے تسلی دے رہے ہوں،ہمت دے رہے ہوں۔وہاں سے اٹھتے ہوئے اس نے دور پھولوں کی بچھی چادر والی قبر کو دیکھا۔

" میں تمہیں چاہ کر بھی نہیں بھول سکتا زندگی۔تمہاری یادیں اب میرے مرنے کے بعد ہی دفن ہوں گی۔" اس نے یہ سوچتے ہوئے قدم اٹھائے۔دو بے نام سے موتی آنکھوں سے نکل کر گال پر پھسل گئے۔

وہ ہاتھوں میں پھولوں کا دستہ لیے کمرے میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس کے پاس آیا۔ جو تکیے سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندیں لیٹی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ پر آنکھیں کھولیں تو اسے اپنے سامنے دیکھا۔ براؤن بلیک پینٹ شرٹ میں ملبوس، لبوں پر دھیما دھیما تبسم۔

''کیسی ہو؟'' پھول اس کی طرف بڑھا کر پوچھا۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ میری لاتعلقی نے اسے بھی تو اذیت سے دوچار کیا ہو گا۔ جس طرح میں اذیت میں تھا۔ اس نے سوچا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' کملائی ہوئی آواز میں جواب آیا۔ وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''عالیہ۔'' اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

''کیا اگر میں تم سے معافی مانگوں تو مجھے معاف کر دو گی؟'' اس کے آنکھوں میں دیکھتے ہوا پوچھ رہا تھا۔

''نہیں دری۔ آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں میں سمجھ سکتی ہوں۔ اس میں آپ کا کیا قصور یہ تو قسمت میں لکھا تھا اور خدا کے لکھے پر شکوہ کیسا؟'' نفی میں سر ہلاتے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''تمہارا ظرف بہت بڑا ہے عالی۔ تم بہت اچھی ہو۔ میں پوری کوشش کروں گا تمہیں خوش رکھوں۔ زیست کی مسافت میں اگر کہیں ڈگمگا گیا تو میرا ساتھ دو گی؟'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کا شوہر ایک لمبی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ دکھ۔ اذیت، کرب، کسی کا بچھڑ جانا۔ اب اسے ہی تو اس کو سنبھالنا تھا

''میں آپ کے ساتھ ہوں دری۔ ہمیشہ آپ کا ساتھ دوں گی۔ اور آپ بھی وعدہ کریں

مجھ سے کچھ نہیں چھپائیں گے۔ میرے ساتھ اپنے آنسو، اپنے دکھ بھی شیئر کریں گے۔ میاں بیوی صرف خوشی کے ساتھی تو نہیں ہوتے ناں، وہ تو دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں۔ آپ کا جب بھی دل اداس ہو۔ آپ مجھے خود کو تنہا کرنے کی بات نہیں کریں گے۔" وہ اس سے پوچھ، وعدہ چاہ رہی تھی۔ اس کے دکھ میں شریک ہونا چاہ رہی تھی۔ بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہ مسکرا دیا۔ اور وہ آسودگی سے اس کے کندھے پر سر اٹکا گئی۔

اب اسے ہی اس کے ساتھ چلنا تھا۔ اس کے ہمقدم۔ وہ اس کی شریک حیات تھی۔ کب تک وہ اس کو نظر انداز کرتا، اس کو بھولتا۔ آخر اس کے پاس آنا ہی تھا۔ اس بات کا احساس ہوتے اس کے دیر ہوئی تھی لیکن زیادہ نہیں۔

"تم جہاں بھی ہو اب مطمئن ہو گی زندگی۔" اس نے آنکھیں موند کر سوچا۔

"چلو گھر چلتے ہیں۔ سب انتظار کر رہے ہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ آج دو دن بعد ہاسپٹل سے اسے چھٹی ملی تھی اور وہ اسے لینے آیا تھا۔

زندگی میں کچھ لوگ آتے ہیں اور ہمارے دلوں پر اپنے گہرے نشان چھوڑ جاتے ہیں جو کبھی بھی مٹتے نہیں بلکہ ان کی یاد وہ نشان اور گہرے کر دیتی ہے۔ اور زندگی بھی ان کے دلوں میں کچھ ایسے ہی بسی ہوئی تھی۔ جس کی یاد دریاب مرزا کے ساتھ باقی سب کے دلوں میں بھی شاید تاحیات رہنے والی تھی۔

ہاتھ کی لکیروں سے کس طرح نکالوں میں
تیری یاد کے موسم، تیرے نام کی آہٹ

۞ ...... ختم شد ...... ۞